مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149
H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001
Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

فہرست حدیث ضعیف کی استدلالی حیثیت

حدیث ضعیف اور بے اعتدالی	2
حدیث ضعیف کی تعریف	2
مذکورہ تعریف پر اشکال	6
ضعف حدیث کے اسباب	8
پہلی قسم کے اسباب	8
تعلیق	8
ارسال	10
اعضال	12
انقطاع	13
تدلیس	14
دوسری قسم کے اسباب	17
اسباب جرح اور فقہاء کرام	24
حدیث مرسل کا حکم	24
منقطع کا حکم	29
تدلیس اور فقہاء کرام	29
جہالت راوی: اقسام واحکام	31
بدعت: اقسام واحکام	34
حدیث ضعیف کا اجمالی حکم	39
حدیثِ موضوع	43
حدیث موضوع کی تعریف	43
حدیث موضوع کی پہچان	44
حدیث موضوع کا حکم	48
حدیث ضعیف متلقی بالقبول	49
تلقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟	50

حدیث متلقی بالقبول کا درجہ اور حکم	51
تلقی کی دو صورتوں میں فرق	53
حدیث ضعیف مؤید بالقرائن	54
حدیث منجبر الضعف کس جگہ معتبر ہے؟	56
انجبارِ ضعف کے اسباب وقرائن	57
متابعت	58
شاہد	59
تعدد طرق سے کیا مراد ہے؟	61
دوسری سند بھی ضعیف ہو تو	62
تعدد طرق میں کیا ایک ہی صحابی کی روایت ہونا شرط ہے	62
دوسری روایت میں لفظ ومعنے دونوں کی موافقت شرط ہے؟	63
کون سی حدیث جابر ضعف ہو سکتی ہے؟	63
احکام میں حدیث ضعیف سے استدلال	65
حدیث ضعیف احکام میں	65
متقدمین کی اصطلاح میں ضعیف کا مفہوم	69
حدیث ضعیف، فضائل میں	77
بعض معاصرین کی غلطی کا ازالہ	78
ضعیف پر عمل کے شرائط	79

باسمہ تعالی

احادیث ضعیفہ کی استدلالی حیثیت

اسلام کے بنیادی مآخذ میں سے ایک اہم ترین ماخذ ''حدیث'' ہے، مگر چونکہ حدیث راویوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچتی ہے اس لئے راویوں کی حیثیت اوران کے مرتبہ ومقام کے تفاوت وفرق کی وجہ سے حدیث کے بھی مختلف مراتب ومدارج قرار دیے گئے ہیں۔ اسی طرح سلسلۂ سند میں اتصال وانقطاع، رفع وارسال وغیرہ اورمتن میں شذوذ ونکارت یا اس کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی حدیث کے الگ الگ درجات قائم کیے گئے ہیں، اوراس طرح حدیث کی بیسیوں قسمیں اوران کے الگ الگ درجات واحکام بتایے گئے ہیں اور اس طرح بعض اقسام مقبول ولائق اعتبار وقابل احتجاج ہیں تو بعض اوراقسام مردود ونا قابل اعتبار قرار دی گئی ہیں۔

صحیح اوراسی طرح حسن، حدیث کی ان اقسام میں داخل وشامل ہیں جن کو باتفاق علماء مقبول گردانا گیا ہے اوران سے احتجاج کو درست ٹھرایا گیا ہے، اوران کے بالمقابل ''موضوع'' وہ حدیث ہے جس کو کلیۃً نا قابل اعتبار واستناد مانا گیا ہے۔ البتہ حدیث کی وہ قسم جس کو ''حدیث ضعیف'' کہا جا تا ہے، اس کا درجہ وحیثیت کیا ہے؟ اس پر غور وخوض کی اور بحث ومطالعہ کی ضرورت ہے؛ اس لئے کہ ضعیف حدیث کلیۃً مستحق رد ہے یا علی الاطلاق قابل اعتبار ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے؟ اس پر آج کل غور کئے بغیر اس میں افراط وتفریط سے کام لیا جارہا ہے اور بہت سے طبقوں اور حلقوں میں اس سلسلہ میں حدود اعتدال سے تجاوز وانحراف کا مظاہرہ بھی دیکھا جا

رہا ہے، درج ذیل مقالے کا یہی موضوع ہے۔

حدیث ضعیف اور بے اعتدالی

حدیث ضعیف کی تعریف اور ضعف حدیث کے اسباب اور حدیث ضعیف کا حکم کیا ہے؟ ان بنیادی سوالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ محدثین کرام نے ہر دور میں حدیث ضعیف اور حدیث موضوع کے درمیان فرق کیا ہے، اگر چہ حدیث موضوع ایک تعریف کے اعتبار سے حدیث ضعیف ہی کی ایک قسم ہے، مگر مطلق حدیث ضعیف کو موضوع کے درجہ میں کسی نے نہیں رکھا، بلکہ مطلق ضعیف کی ایک بدترین قسم کو موضوع کہا گیا ہے، اور دیگر اقسام کو اس سے الگ اور ممتاز رکھا گیا ہے، مگر ادھر چند برسوں سے ایک خاص حلقے کی طرف سے جن میں علماء عرب بھی داخل ہیں، مطلق حدیث ضعیف کو موضوع کے درجہ میں قرار دیا جانے لگا ہے اور اس کے ساتھ تقریباً وہی معاملہ کیا جا رہا ہے جو ''حدیثِ موضوع'' کے ساتھ کیا جانا چاہئے، اور دوسری طرف بعض حضرات حدیث ضعیف میں تساہل کا معاملہ برتتے ہوئے ہر قسم کی احادیث ضعیفہ کو قبول کرنے اور ان سے استدلال واحتجاج کرنے لگے ہیں، خواہ وہ شدید الضعف ہی کیوں نہ ہو اور عموماً واعظ اور خطیب حضرات اور دعوت وتبلیغ کے حلقوں سے وابستہ علماء میں یہ تساہل وتغافل زیادہ مشاہد ہے، حالانکہ یہ دونوں طریقے راہ اعتدال سے انحراف کے ہیں۔ اس لئے ہم اولاً ضعیف حدیث اور اس کے حکم پر روشنی ڈالیں گے، پھر حدیث موضوع پر بحث کی جائے گی۔

حدیث ضعیف کی تعریف

علماء محدثین نے حدیث ضعیف کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

"ھو ما لم یجتمع فیه شروط الصحیح ولا شروط الحسن"

(حدیث ضعیف وہ ہے جس میں نہ صحیح حدیث کی شرائط جمع ہوں اور نہ حدیث حسن کی شرائط جمع ہوں)

علامہ ابن الصلاحؒ نے ''مقدمہ'' میں اور علامہ نوویؒ نے ''ارشاد طلاب الحقائق'' میں اور علامہ عراقی نے ''الفیہ'' میں اور علامہ ابن جماعہ نے ''منہل الروی'' میں، علامہ عبدالحق محدث نے ''مقدمۂ مشکوۃ'' میں یہی تعریف فرمائی ہے۔ (۱)

اوپر جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں، وہ علامہ نووی کے ہیں۔ ابن الصلاح کے الفاظ یہ ہیں:

" كل حديث لم يجتمع فيه صفات الحديث الصحيح ولا صفات الحديث الحسن المذكورات فيما تقدم فهو حديث ضعيف"

حدیث ضعیف کی مذکورہ تعریف جیسا کہ ظاہر ہے منفی انداز کی ہے اور اس کا سمجھنا صحیح اور حسن کی تعریف کو سمجھنے پر موقوف ہے، لہٰذا اولاً یہ جاننا پڑے گا کہ حدیث صحیح اور حدیث حسن کی شرائط وصفات کیا ہیں جن کے نہ ہونے سے حدیث ضعیف قرار پاتی ہے۔

محدثین نے صحیح حدیث کے لیے درج ذیل شرائط بیان کیے ہیں:

(۱) سلسلۂ سند متصل ہو۔

(۲) سند کے تمام راوی عادل وضابط ہوں۔

(۳) وہ شاذ نہ ہو۔

(۴) معلّل نہ ہو۔ (۲)

---

(۱) مقدمہ ابن الصلاح: ۱۷، ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۱۵۳، الفیۃ العراقی: ۱۶، المنہل الروی: ۱/۳۸، مقدمہ عبدالحقؒ: ۳ (۲) ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۱۱۰، نزھۃ النظر: ۲۵

اورحدیث حسن کی تعریف میں علماء حدیث نے طویل کلام فرمایا ہے۔اور ابن الصلاحؒ نے اس کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں:

(ا)"الذي لا يخلو رجال إسناده من مستور لم تتحق أهليته ، غير أنه ليس مغفلًا كثيرَ الخطاء فيما يرويه ولاهو مُتّهَم بالكذب في الحديث أى لم يظهر منه تعمّد الكذب في الحديث ولاسبب آخر مُفَسِّق ويكون متن الحديث مع ذلك قد عُرِفَ بأن رُوِىَ مثلُه اونحوُه من وجه آخر أو أكثر حتى اعتضد بمتابعة من تابع راويه على مثله أوبماله من شا هد"(ا)

(یعنی حدیث حسن کی ایک قسم وہ ہے جس کی سند میں کوئی مستور الحال راوی ہو، جس کی اہلیت متحقق نہ ہوئی ہو، لیکن وہ راوی غفلت کا شکار نہ ہو، اور روایت کرنے میں کثیر الخطاء نہ ہو، اور نہ حدیث میں کذب بیانی سے متہم ہو، یعنی اس سے کذب بیانی عمداً ظاہر نہ ہو، اور کوئی اور سبب جس سے وہ فاسق قرار دیا جائے نہ پایا جائے، اور اسی کے ساتھ حدیث جس کی وہ راوی روایت کرتا ہے، اس کا متن بعینہ یا اس کے قریب قریب دوسرے کسی ایک طریق سے یا زیادہ طرق سے مروی ہو، یہاں تک کہ اس کے متابع یا شاہد سے وہ قوت پا جائے)

(۲)"أن يكون راويه من المشهورين بالصدق والأمانة غير أنه لم يبلغ درجةَ رجال الصحيح لكونه يقصر عنهم فى الحفظ والإتقان ، وهومع ذالك يرتفع عن حال من يُعَدُّ ماينفرد به من حديث مُنُكَراً ، ويُعْتَبَرُ في كل هذا - مع سلامة الحديث من أن يكون شاذّاً و مُنكراً - سلامته من أن يكون مُعلَّلاً". (۲)

(یعنی حسن کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کا راوی ان لوگوں میں سے ہو جو صدق

(ا)مقدمہ ابن الصلاح:۱۳۰(۲)مقدمہ ابن الصلاح:۱۳۰

وامانت میں مشہور ومعروف ہیں، لیکن وہ صحیح حدیث کے راویوں کے درجہ کو نہ پہنچے، بوجہ اس کے کہ حفظ واتقان میں ان کے درجہ سے کم درجہ پر ہے، مگر اس کے باوجود وہ اس راوی سے بلند درجہ پر ہو جس کے تفرد کی وجہ سے اس کی حدیث کو منکر قرار دیا جاتا ہے، اور ان دونوں قسموں میں اس کا بھی اعتبار ہے کہ حدیث شاذ ومنکر ہونے سے سالم ہونے کے ساتھ ساتھ معلل ہونے سے بھی محفوظ ہو)۔

حاصل یہ ہے کہ جس روایت کا راوی مستور الحال ہو اور اس حدیث کا متن دوسرے طرق سے بھی مروی ہو، یعنی اس کی متابعت کی گئی ہو یا اس کے شواہدات موجود ہوں، وہ روایت حسن ہوتی ہے۔ اسی طرح راویٔ حدیث صدق ومانت کی صفات سے متصف ہو، لیکن صحیح کے راویوں کا ہم رتبہ نہ ہو، لیکن ضعیف راوی سے بلند درجہ رکھتا ہو، اس کی روایت بھی حسن ہوتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ حسن کی ان دونوں قسموں میں شرط یہ ہے کہ حدیث شذوذ ونکارت اور علت خفیہ سے بھی خالی اور سالم ہو۔ (۱)

اور حافظ ابن حجرؒ نے حسن کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

"فان خفّ الضبط (و المراد مع بقية الشروط المتقدمة في حد الصحيح) فهو الحسن لذاته. (۲)

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر صحیح کے تمام شرائط کے ساتھ، صرف ضبط واتقان میں کمی ہو تو وہ حدیث حسن لذاتہ ہے۔

جب حدیث صحیح وحدیث حسن کی تعریف سامنے آ گئی تو اب یہ سمجھنا ہے کہ جو حدیث، حدیث صحیح کی اور حدیث حسن کی شرائط وصفات میں سے ایک سے بھی خالی ہو تو وہ ضعیف کہلاتی ہے۔

(۱) ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۱۴۰ (۲) نزھۃ النظر: ۳۴

مذکورہ تعریف پر اشکال

مگر اوپر بیان کردہ "حدیث ضعیف" کی اس تعریف پر ایک سخت اشکال واقع ہوتا ہے، وہ یہ کہ مذکورہ تعریف میں صفات حدیث صحیح کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ جب کوئی حدیث صفات حسن سے خالی ہوگی تو وہ صفات صحیح سے بھی ضرور خالی ہوگی، لہذا یہ قید زائد ہے۔

اسی لیے علامہ برہان الدین الابناسی نے "الشذا الفياح من علوم ابن الصلاح" میں کہا کہ " لا حاجة إلى نفي صفات الصحيح ، لأنه يكفي فيه نفي صفات الحسن ـ (۱)

مگر علامہ بدرالدین الزرکشی نے اس اشکال کا جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقام تعریف اس کا تقاضا کرتا ہے، نیز صفات حسن کے نہ پائے جانے سے صفات صحیح کا نہ پایا جانا لازم نہیں؛ کیونکہ صحیح کی جو شرائط ہیں اس کے لحاظ سے اس کو حسن نہیں کہا جا سکتا، یہ دو الگ الگ قسمیں ہیں تو ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی نہیں ہوسکتی، وہ فرماتے ہیں کہ اس کی نظیر نحویوں کا اسم و فعل کی تعریف کے بعد یہ کہنا ہے کہ حرف وہ ہے جو نہ اس کی علامت کو قبول کرے اور نہ فعل کی علامت قبول کرے۔ (۲)

مگر یہ جواب محل نظر ہے، اسی لیے علامہ ابن حجر عسقلانی نے " **النكت على ابن الصلاح**" میں کہا کہ:

" وأقول :والتنظير غير مطابق ، لأنه ليس بين الاسم والفعل والحرف عموم ولا خصوص بخلاف الصحيح والحسن ،فقد قررنا فيما مضى أن بينهما عموماً و خصوصاً ، وأنه يمكن اجتماعهما وانفراد كل منهما بخلاف الاسم والفعل والحرف .(۳)

---

(۱) الشذا الفیاح: ۱/۱۳۴ (۲) النکت علی ابن الصلاح: ۱/۳۹۰ (۳) النکت علی ابن الصلاح: ۱/۴۹۱

ابن حجر کے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ نحویوں کے قول کی جو نظیر یہاں پیش کی گئی ہے وہ یہاں منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اسم وفعل وحرف کے مابین وہ نسبت نہیں ہے جو صحیح وحسن کے درمیان میں ہے؛ کیونکہ صحیح وحسن کے مابین عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے اور اس لحاظ سے بعض صورتوں میں یہ دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں اور دونوں الگ الگ بھی پائے جا سکتے ہیں، بخلاف اسم وفعل وحرف کے کہ ان میں ایسا نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر نے پھر فرمایا کہ حق یہ ہے کہ ابن الصلاح کا کلام قابل اعتراض ہے؛ کیونکہ ان کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحیح کی صفات میں سے کوئی صفت حدیث میں نہ پائی جائے تو اس کو ضعیف کہا جائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ مثلا کسی حدیث میں ''حدیث صحیح'' کی صفات میں سے ''تام الضبط'' ہونے کی صفت اگر نہ پائی جائے تو یہ بات صادق آئی کہ ''اس میں حدیث صحیح کی صفات جمع نہیں ہیں'' حالانکہ اس حدیث کو جس میں ''تمام الضبط'' کے سوا دوسری صفات صحیح جمع ہوں حسن کہا جاتا ہے نہ کہ ضعیف۔ (۱)

الغرض حدیث ضعیف کی یہ تعریف قابل اشکال ہے، اس لیے بعض محدثین نے اس تعریف سے عدول کیا اور ضعیف کی تعریف میں یہ فرمایا کہ " وأما الحديث الضعيف فهو ما لم يبلغ رتبة الحسن ولو بفقد صفة من صفاته" (ضعیف وہ ہے جو حدیث حسن کے مرتبہ کو نہ پہنچی ہو اگرچہ اس کی صفات میں سے ایک صفت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہو)

علامہ ابن دقیق العید نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور علامہ عراقی نے بھی یہی لکھا ہے، علامہ سخاوی نے بھی یہی لکھا ہے۔ (۲)

---

(۱) النکت علی ابن الصلاح: ۱/۴۹۲ (۲) التدریب: ۱۰۵، الفیہ العراقی: ۱۶/۷، فتح المغیث: ۱/۹۶

اور ابن حجر عسقلانی نے ابن الصلاح کے مقدمہ پر اپنی تعلیق میں ضعیف کی تعریف اس طرح کی ہے:

" هو مالم تتوفر فيه صفات القبول" (یعنی جس میں صفات قبول نہ پائی جائیں)۔ (۱)

یہ تعریف بڑی حد تک جامع ہے اور اشکال سے بھی پاک ہے۔

ضعف حدیث کے اسباب

حدیث میں ضعف کی وجہ بہت سے اسباب بنتے ہیں اور ان میں سے بعض اسباب کا تعلق راوی کے اوصاف وعادات سے ہے اور بعض کا تعلق سند میں کسی راوی کے سقوط وحذف سے ہے۔ اس طرح ضعف کے اسباب دو قسم کے قرار پاتے ہیں:

پہلی قسم کے اسباب

پہلی قسم کے اسباب وہ ہیں جو سند میں حذف وسقوط سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

تعلیق

تعلیق محدثین کی اصطلاح میں یہ ہے کہ محدث سند کے شروع کا حصہ ساقط کر دے، خواہ ایک راوی کو حذف وساقط کرے یا زیادہ کو۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"إن التعليق مستعمل فيما حُذِفَ من مبتدأ إسناده واحدٌ فأكثر، واستعمله بعضُهم في حَذُف كل الإسناد" (۲)

اور ابن حجر عسقلانی: نے لکھا ہے کہ:

---

(۱) النکت علی ابن الصلاح: ۱/۴۸۶۷ (۲) ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۱۹۷

"والمراد بالتعلیق ماحُذِفَ من مبتدأ إسناده واحدٌ فاکثر ولوإلٰی آخر الاسناد۔" (۱)

حاصل یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں تعلیق سند کے شروع سے ایک دو یا زیادہ راویوں کے حذف کر دینے کا نام ہے اور ایسی حدیث کو جس کی سند کے شروع کا حصہ حذف کر دیا گیا ہو، معلق کہتے ہیں۔

حدیث معلق کی مثال یہ ہے کہ مثلاً امام بخاری سند ذکر کیے بغیر کہتے ہیں کہ قال رسول ﷺ کذا ، یا کہتے ہیں: روٰی جابر عن النبي ﷺ کذا.

اس کے ضعیف ومردود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو راوی محذوف ہے، اس کا حال معلوم نہیں، ہاں اگر کسی اور طریق سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ محذوف راوی کون ہے اور وہ عادل وضابط ہو، تو حدیث معلق، مقبول بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"وانما ذُکِرَ التعلیقُ فی قسم المردود للجھل بحال المحذوف، وقد یُحُکَمُ بصحته إن عُرِفَ بأن یجیء مُسَمّٰی من وجه آخر". (تعلیق کا ذکر حدیث مردود کی قسم میں اس لئے کیا گیا کہ محذوف راوی کا حال معلوم نہیں، اور کبھی اس کے صحیح ہونے کا حکم دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے طریق سے اس محذوف کا نام آجانے کی وجہ سے وہ معلوم ہو جائے)۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیق مطلقاً اسباب ضعف میں سے نہیں ہے، بلکہ اصل وجہ راوی کا مجہول الحال ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الصلاح نے فرمایا کہ:

اگر راوی کا حذف ایسی کتاب میں ہوا ہے جس میں صحت کا التزام کیا گیا ہے جیسے بخاری مسلم کی کتابیں، تو ان میں جو روایت بصیغۂ جزم وارد ہو، تو یہ اس کی اسناد

---

(۱) ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری: ۱۷ (۲) نزہۃ النظر: ۵۲

کے ثابت ہونے کی دلیل ہوگی اور سند کا حذف کرنا مختلف اغراض میں سے کسی کی وجہ سے ہوگا اور اگر بصیغۂ جزم نہ وارد ہو، تو اس میں کلام ہوگا۔ (۱)

ارسال

ضعفِ حدیث کا دوسرا سبب ارسال ہے، اور وہ یہ ہے کہ سند کے آخر سے تابعی کے بعد راوی کو حذف کر دیا جائے، اور جس حدیث میں ارسال واقع ہوا ہو اس کو ''حدیثِ مرسل'' کہا جاتا ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تابعی یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور صحابی کا واسطہ ذکر نہ کرے۔

امام ابو عبد اللہ الحاکم نے فرمایا کہ:

"إن مشائخ الحديث لم يختلفوا في أن الحديث المرسَل هو الذي يرويه المُحَدِّث بأسانيد متّصلة إلى التابعي قال رسول الله ﷺ " (مشائخ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حدیث مرسل وہ ہے جس کو محدث متصل سندوں کے ساتھ اس تابعی تک روایت کرے جو یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) (۲)

ارسال کی تعریف جو اوپر لکھی گئی، جمہور محدثین کے نزدیک یہی مختار ہے، اور فقہاء کے نزدیک سند کے کسی بھی حصہ میں سقوط و حذف واقع ہوا ہو، اس کو ارسال کہتے ہیں اور بعض محدثین جیسے خطیب بغدادی بھی اسی کے قائل ہیں۔

علامہ ابن الصلاح مرسل کی مذکورہ تعریف بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" وله صُوَرٌ اختُلِفَ فيها : أهي من المرسل أم لا؟ أحدها : إذا انقطع الإسناد قبل الوصول إلى التابعي فكان فيه رواية راو لم يَسْمَعْ من المذكور فوقَه ، فالذي قَطَعَ به الحاكم الحافظ أبو عبد الله وغيره من

(۱) نزہۃ النظر: ۵۲ (۲) معرفۃ علوم الحدیث: ۳۲

أهل الحديث :أنّ ذلك لا يُسَمّٰى مُرُسَلاً ....إلى أن قال........
:والمعروف في الفقه و أصوله :أن كُلّ ذلك يُسَمّٰى مُرسَلاً ، وإليه ذهب من أهل الحديث أبو بكر الخطيب وقطع به ، وقال: إلا أن أكثر ما يُوُصَفُ بالإرسال من حيث الاستعمال ما رواه التابعي عن النبيﷺ". (۱)

(اس کی یعنی مرسل کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں اختلاف کیا گیا ہے، ایک یہ کہ جب سند تابعی تک پہنچنے سے پہلے منقطع ہوجائے اور اس میں ایسا راوی ہو جس نے اپنے سے اوپر والے سے حدیث نہیں سنی ہے تو حاکم ابوعبداللہ وغیرہ محدثین نے اس کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا نام مرسل نہیں ہے، ....پھر فرمایا کہ.......فقہ اور اصول فقہ میں معروف یہ ہے کہ ان سب کو بھی مرسل کہا جاتا ہے، اور محدثین میں سے ابوبکر خطیب بھی اسی طرف گئے ہیں اور اسی پر جزم کیا ہے، اور کہا کہ: ''مگر استعمال کے لحاظ سے مرسل سے جس کو زیادہ تر موصوف کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تابعی رسول اللہﷺ سے روایت کرے)

اسی طرح فقہاء صحابی کی صحابی سے روایت کو بھی مرسل سے تعبیر کرتے ہیں، مگر محدثین کے نزدیک اس کو مرسل نہیں کہتے۔

ارسال کو اسباب ضعف میں سے اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ محذوف راوی کے حال کی خبر نہیں ہے؛ کیونکہ وہ محذوف راوی صحابی بھی ہوسکتا ہے اور تابعی بھی ہوسکتا ہے، اور تابعی ہونے کی صورت پر اس کے ثقہ وضعیف ہونے کے دونوں احتمال پائے جاتے ہیں، اور اگر وہ ثقہ بھی ہو تو احتمال ہے کہ اس نے صحابی سے روایت لی ہو یا تابعی سے لی ہو، پھر تابعی سے لینے کی صورت پر ثقہ وضعیف ہونے کے احتمالات

(۱) مقدمہ ابن الصلاح :۳۱

ہیں، اوراس طرح درمیان سے چھ راویوں کے ساقط ہونے کا احتمال ہے؛ کیونکہ تابعی کا تابعی سے روایت کرنے میں استقراء سے چھ تک کا سلسلہ ملا ہے، اور ہر ایک میں ثقہ وغیر ثقہ ہونے کا احتمال موجود ہے۔(۱)

مگر ارسال بھی تمام کے نزدیک اسباب ضعف میں سے نہیں ہے، جیسا کہ آگے چل کر اس کی تفصیل آرہی ہے۔

اِعضال

اسباب ضعف حدیث میں سے ایک اعضال ہے اور وہ یہ ہے کہ سند میں سے دو یا زیادہ راوی پے در پے حذف کر دیے جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ایک راوی محذوف ہو یا دو راوی یا زیادہ، متعدد جگہوں سے ساقط ہوں تو اس کو اصطلاحاً اعضال نہیں کہتے اور جس روایت میں اعضال ہو اس کو "مُعْضَل" کہتے ہیں۔

امام نوویؒ نے کہا کہ :"وھو عبارۃ عن ما سقط من إسنادہ اثنان فصاعداً، کقول مالك و غیرہ من تابعي التابعین : قال رسول اللہ ﷺ، و کقول الشافعي و غیرہ من أتباع التابعین :قال أبو بکر أو عمر "(معضل نام ہے اس حدیث کا جس کی سند میں سے دو یا زیادہ راوی ساقط ہو جائیں، جیسے امام مالک یا دیگر تبع تابعین کا یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یا جیسے امام شافعی یا کسی اور تبع تابعین کے اتباع کا یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا)۔(۲)

علامہ ابن الصلاح نے "مقدمہ" میں بھی اسی طرح لکھا ہے، مگر اس میں ایک قید ملحوظ ہے وہ یہ کہ یہ دو راویوں کا سقوط ایک ہی جگہ سے پے در پے ہو، اگر ایک جگہ سے دو کا سقوط نہیں ہوا، بلکہ دو الگ الگ جگہوں سے ہوا تو اس کو اصطلاحاً معضل نہیں

(۱) نزہۃ النظر: ۵۳-۵۴، فتح المغیث: ۱/۱۴۲ (۲) ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۱۸۳

بلکہ منقطع کہا جاتا ہے۔چنانچہ علامہ الزرکشی نے اپنی کتاب "النكت على ابن الصلاح" میں فرمایا کہ " ومرادهم سقوطهما من موضع واحد ،فإن سقطا من موضعين كان منقطعا من وجهين ولا يسمىٰ معضلا اصطلاحا . (۱)

اسی طرح علامہ عراقی نے "التقييد والإيضاح" میں لکھا ہے کہ :" أطلق المصنف اسم المعضل على ما سقط منه اثنان فصاعدا ولم يفرق بين أن يسقط ذلك من موضع واحد أو من موضعين ،وليس المراد بذلك إلا سقوطهما من موضع واحد ،فأما إذا سقط راو من مكان ثم راو من مكان آخر فهو منقطع في موضعين وليس معضلا في الاصطلاح ۔(۲)

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر دوراوی ایک ہی جگہ سے پے در پے ساقط ہو جائیں تو اصطلاح محدثین میں اس کو معضل کہا جاتا ہے اور اگر دو الگ الگ مقامات سے دو راویوں کا سقوط ہوا ہے تو یہ دو جگہ سے منقطع کہلاتی ہے۔

انقطاع

اسباب ضعف میں سے ایک انقطاع ہے،اور وہ یہ ہے کہ سند میں سے ایک یا دو یا زیادہ راوی حذف ہو جائیں،مگر یہ حذف پے در پے یعنی ایک ہی جگہ سے نہ ہو، بلکہ سند میں مختلف جگہوں سے ہو۔

علامہ ابن الحنبلی نے "قفو الأثر" میں لکھا ہے کہ " ومنه المنقطع وهو ما سقط من سنده واحد أو أكثر مع عدم التوالي من أي وجه كان السقط" (حدیث مردود میں سے ایک منقطع بھی ہے اور منقطع وہ ہے جس کی سند میں سے ایک راوی یا زیادہ کسی بھی طرح ساقط ہو جائیں جبکہ پے در پے ساقط نہ ہوں)(۳)

(۱۲)النکت:۱۴/۲(۲)التقیید والایضاح:۸۱/۱(۳)قفوالأثر:۶۹/۱

اس سے معلوم ہوا کہ معضل و منقطع کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے کہ جو حدیث معضل ہوگی وہ منقطع بھی ہوگی ،لیکن ہر منقطع معضل نہیں ہوتی ۔اور بعض حضرات محدثین مرسل کو بھی منقطع کہد یتے ہیں،جس طرح منقطع کو مرسل کہد یا جاتا ہے۔

تدلیس

حدیث ضعیف ہونے کے اسباب میں سے ایک تدلیس ہے،اور محدثین نے اس کی دوصورتیں بیان کی ہیں:

(ا)ایک یہ کہ راوی اس شخص سے جس سے اس کی ملاقات ہے یا وہ اس کا معاصر ہے، ایسی حدیث روایت کرے جس کو اس سے اس نے سنا نہیں اور اس میں وہ 'حَدَّ ثَـنَا'' یا '' أَخْبَرَنَـا '' وغیرہ الفاظ نہیں کہتا جو سماع پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں، بلکہ '' قال فلان''(فلاں نے کہا) یا ''عن فلان'' (فلاں سے روایت ہے) کہہ کر بیان کرتا ہے،اس کو تدلیس الاسناد کہتے ہیں۔

محدثین کہتے ہیں:" التدليس قسمان: أحدهما :تدليس الإسناد وهو أن يروي عمن لقيه ما لم يسمع منه مُوُهِمًا أنه سَمِعَه منه أو عمَّن عَاصَرَه ولم يلقِهِ مُوُهِمًا أنه قد لَقِيَهُ ،ومن شأنه أن لا يقول في ذلك : أخبرنا فلان ولا حَدّثَنا أو ما أشبهما .(۱)

دوسری قسم تدلیس الشیوخ ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شیخ سے وہ حدیث بیان کرے جو اس نے اس سے سنی ہے،مگر اس کا نام یا کنیت یا نسبت وصفت وہ بیان کرے جس سے وہ شیخ معروف نہیں ہے تاکہ اس کو پہچانا نہ جاسکے۔(۲)

(ا) مقدمہ ابن الصلاح:۴۲،ارشاد طلاب الحقائق:۲۰۵/۱،الکفایہ:۳۶۳-۳۶۴(۲) مقدمہ ابن الصلاح:۴۲،ارشاد طلاب الحقائق:۲۰۸/۱،الکفایہ:۳۶۵

تدلیس الاسناد کی جوصورت بیان کی گئی ،اس میں ابن حجرؒ نے کچھ کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

اگر راوی ایسے شخص سے روایت کرتا ہے جس سے اس کی ملاقات معروف وثابت ہو،مگر یہ خاص روایت اس سے سنا نہیں ہے تو اسکو تدلیس کہتے ہیں ،اور اگر اس سے محض معاصرت حاصل ہے، ملاقات ثابت نہیں تو ایسی روایت کو مرسل خفی کہتے ہیں ۔(۱)

نیز خطیب بغدادی کی عبارات سے بھی ان کی یہی رائے ظاہر ہوتی ہے۔(۲)

خطیب بغدادی نے تدلیس کی ایک اورصورت بھی بیان فرمائی ہے،اس کو تدلیس التسویہ کہتے ہیں ،چنانچہ کہتے ہیں کہ " وربما لم يسقط المدلس اسم شيخه الذي حدثه لكنه يسقط ممن بعد في الإسناد رجلا يكون ضعيفا في الرواية أو صغير السن ويحسن الحديث بذلك "(بعض وقت راوی اپنے شیخ کو ساقط نہیں کرتا بلکہ شیخ کے بعد جو راوی ضعیف ہو یا صغیر السن ہو، اسکو حذف کر دیتا ہے تا کہ حدیث کی سند حسن معلوم ہو)۔(۳)

تدلیس کے سلسلہ میں محدثین وفقہاء کا اختلاف ہے کہ وہ سببِ ضعف وجرح ہے یا نہیں؟ تدلیس الاسناد کی اکثر علماء نے مذمت کی ہے اور مکروہ قرار دیا ہے۔امام شعبہؒ نے تو اسکی سخت مذمت کی ہے اور اسکو کذب کا بھائی قرار دیا ہے۔(۴)

پھر جو شخص اس تدلیس میں معروف ہو،(بشرطیکہ وہ خود ثقہ ہو) اس کی روایت کے قبول کرنے کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا ہے۔محدثین وفقہاء کی ایک جماعت نے اس کو مجروح قرار دیکر ہر حال میں نا قابل قبول قرار دیا ہے،خواہ اس

(۱) نزہۃ النظر:۵٦،النکت علی ابن الصلاح:۶۱۴/۲-۶۱۵ (۲) الکفایہ:۳۵۷ (۳) الکفایہ:۳٦۴
(۴) الکفایہ:۳۵٦،تدریب الراوی:۲۲۸/۱،مقدمہ ابن الصلاح:۲۹

نے اپنا سننا بیان کیا ہو یا بیان نہ کیا ہو، مگر اکثر علماء اس بارے میں تفصیل کے قائل ہیں، وہ یہ کہ مدلس راوی نے اگر ایسے الفاظ سے روایت کیا جس میں احتمال ہے کہ اس نے سنا نہ ہو، جیسے ''عن فلان'' کہہ کر روایت کرے تو اسکا حکم مرسل کا ہے اور اگر ایسے الفاظ سے بیان کیا جو سماع پر دلالت کرتے ہیں جیسے ''**سمعت عن فلان**'' یا ''أخبرنا'' یا ''حدثنا'' تو وہ مقبول ہے۔ (۱)

اس سلسلہ میں اور بھی متعدد اقوال ہیں؛ اکثر علماء نے مذکورہ تفصیل کو صحیح قرار دیا ہے۔

اور تدلیس الشیوخ کو اوپر والی صورت سے اخف قرار دیا گیا ہے اور بعض بڑے بڑے ائمہ سے بھی تدلیس الشیوخ مروی ہے، جیسے خطیب بغدادی کے بارے میں علامہ ابن الصلاح نے لکھا ہے کہ:

''والخطيب الحافظ يروي في كتبه عن أبي القاسم الأزهري وعن عبيد الله بن أبي الفتح الفارسي وعن أبي عبيد الله بن أحمد بن عثمان الصيرفي ، والجميع شخص واحد من مشائخه ، وكذلك يروي عن الحسن بن محمد الخلال وعن الحسن بن أبي طالب وعن أبي محمد الخلال، والجميع عبارة عن واحد، ويروي أيضا عن أبي القاسم التنوخي وعن علي بن الحسن وعن القاضي أبي القاسم علي بن الحسن التنوخي وعن علي بن أبي علي المعدل، والجميع شخص واحد، وله من ذلك كثير''۔ (والله أعلم). (۲)

---

(۱) ارشاد طلاب الحقائق: ۱/۲۰۹، النکت: ۲/۴۱۹، مقدمہ ابن الصلاح: ۲۹، الکفایۃ: ۳۶۱ (۲) مقدمۂ ابن الصلاح: ۱۳۹-۱۴۰

(خطیب اپنی کتب میں ابوالقاسم ازہری سے اور عبید اللہ بن ابی الفتح فارسی سے اور ابوعبداللہ بن احمد بن عثمان صیرفی سے روایت کرتے ہیں اور یہ سب دراصل ان کے مشائخ میں سے ایک ہی شخصیت ہے، اسی طرح وہ حسن بن محمد الخلال سے اور حسن بن ابی طالب سے اور ابومحمد الخلال سے روایت کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک ہی شخصیت کے نام ہیں، اور نیز وہ ابوالقاسم التنوخی سے اور علی بن الحسن سے اور قاضی ابو القاسم علی بن الحسن التنوخی سے اور علی بن ابوعلی المعدل سے روایت کرتے ہیں حالانکہ یہ ایک ہی شخص ہے، اور خطیب سے ایسا بہت ہوا ہے)

اور رہی تیسری قسم یعنی تدلیس التسویہ اس کو علماء حدیث نے تدلیس کی اقسام میں سے سب سے بدتر قرار دیا ہے۔ علامہ عراقی کہتے ہیں: "وهو شرّ الأقسام وهو الذي يُسمّونه تدليسَ التسوية وقد سمّاه بذلك أبو الحسن بن القطان وغيره من أهل هذاالشأن" (یہ سب سے بدترین قسم ہے اور یہ وہی قسم ہے جس کو تدلیس التسویہ کہتے ہیں، اس کا یہ نام ابوالحسن بن القطان وغیرہ اس شان کے علماء نے رکھا ہے)۔ (۱)

یہاں تک جو اسباب ضعف حدیث بیان کئے گئے وہ ضعف حدیث کے وہ اسباب ہیں جسکا تعلق سند میں حذف واسقاط سے ہے۔

دوسری قسم کے اسباب

دوسری قسم وہ اسباب ہیں جن کا تعلق راوی کے اوصاف سے ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے راوی میں طعن وجرح کے دس اسباب بیان فرمائے ہیں، اور ان میں سے بعض بعض سے اشد ہیں اور پانچ کا تعلق راوی کی عدالت سے ہے اور پانچ کا تعلق

(۱) التقیید والایضاح: ۱/۹۵، نیز دیکھو: النکت: ۲/۶۰۳، تدریب الراوی: ۱/۲۲۴

راوی کے ضبط واتقان سے ہے۔ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) **کذب**: کہ حدیث میں عمداً جھوٹ بولنا ثابت ہو،ایسے راوی کی حدیث کوموضوع کہا جاتا ہے،اوراسکو پہچاننے کے مختلف طریقے ہیں،ان کی تفصیل حدیث موضوع پر بحث کے ضمن میں آرہی ہے۔

(۲) **تہمتِ کذب**: یعنی راوی کا متہم بالکذب ہونا۔اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی حدیث راوی سے ایسی منقول ہو جو قواعد معلومہ کے بالکل خلاف ہواور یہ حدیث کسی اور سے مروی نہ ہو،تو ایسا راوی متہم بالکذب ہوگا،اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے یہ حدیث گھڑ کر بیان کی ہے مگر چونکہ خاص طور پر اس حدیث میں اس کا کذب ثابت نہیں، لہٰذا یہ پہلے کے اعتبار سے اخف ہوگا۔اسی طرح جس آدمی کا جھوٹا ہونا معروف ہو،اگر چہ حدیث میں اس کا کذب ظاہر نہ ہو،اسکی روایت بھی اسی کے درجہ میں ہوگی ،اور متہم بالکذب کی حدیث متروک کہلاتی ہے۔

(۳) **کثرۃ الغلط** : کثرت کے ساتھ غلطی کرنا بایں طور کہ غلطی صواب سے زیادہ ہو یا برابر ہو، ہاں کبھی کبھی غلطی کا ہوجانا ، بھول کا ہوجانا تو انسان کا خاصہ ہے،اس سے جرح نہیں کی جاسکتی۔اسی لیے ابن معینؒ نے فرمایا کہ:

”لستُ أعجبُ مِمّن يُحدّث فيُخطي وإنما أعجب مِمّن يُحدّث فيُصيبُ “

(مجھے اس پر تعجب نہیں کہ کوئی حدیث بیان کرے اور غلطی کرجائے ، تعجب تو اس پر ہے کہ حدیث بیان کرے اور غلطی نہ کرے)

ابن حجر اسکو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ:

اگر کسی آدمی کی جرح اس لیے کی گئی کہ اس نے کسی حدیث میں غلطی کی یا وہم کا

شکار ہوا یا تفرد کیا، تو یہ کوئی جرح نہیں ہے جس سے اس کی حدیث کو رد کر دیا جائے۔ (۱)

غرض جب راوی کثرت کے ساتھ غلطی کرے تو وہ مجروح ہوتا ہے اور اسکی حدیث بھی منکر کہلاتی ہے۔

(۴) **غفلت**: یعنی حفظ و اتقان میں غفلت کا شکار ہونا، اس سے مراد بھی کثرتِ غفلت ہے ورنہ تھوڑی بہت غفلت تو ہر کسی سے ہو جاتی ہے اور یہ سبب ضعف و جرح نہیں، ہاں اگر کثرت کے ساتھ غفلت کا ظہور ہو تو وہ جرح ہے اور اسکی روایت بھی منکر کہلاتی ہے۔

(۵) **فسق**: یعنی ارتکابِ کبائر، خواہ وہ کبائر عملی ہوں جیسے زنا کاری، شراب نوشی وغیرہ، یا وہ زبانی وقولی ہوں، جیسے غیبت وغیرہ۔ ایسے راوی کی روایت بھی منکر کہلاتی ہے۔

(۶) **وھم**: حدیث بیان کرنے میں وہم لگ جانا بایں طور کہ وہم سے حدیث کی روایت کرے، مگر اس سے بھی مراد کثرت وہم ہے۔ اگر کبھی کبھی وہم ہو جائے تو وہ جرح نہیں ہے اور اس سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ علامہ ابن المبارکؒ نے فرمایا: "من ذا سَلِمَ من الوَھم؟"۔ (۲)

ہاں کثرت سے وہم کا شکار ہوتا ہو تو یہ جرح ہے، مثلاً ایک حدیث کو دوسری حدیث میں داخل کر دیتا ہے یا منقطع و مرسل کو موصولاً و مسنداً بیان کرتا ہے وغیرہ۔ اگر کوئی ماہر نقاد حدیث اس وہم پر مطلع ہوتا ہے اور قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں تو ایسی حدیث معلّل کہلاتی ہے اور یہ علم بڑا دقیق ہے۔

(۷) مخالفتِ ثقات: یعنی ثقہ و قابلِ اعتماد راویوں نے جو اور جیسا روایت کیا،

---

(۱) لسان المیزان: ۲۸/۱ (۲) لسان المیزان: ۲۸/۱

اس کے خلاف روایت کرنا، یہ بھی جرح ہے جس سے راوی ضعیف قرار پاتا ہے۔اور یہ مخالفت کئی طرح پر ہے:

۱- سیاق سند میں تغیر واقع ہو۔ایسی حدیث کو جس کی سند میں راوی نے تغیر کردیا جبکہ دوسرے ثقہ راوی اس کے خلاف ہیں، مدرج الاسناد کہتے ہیں۔اوراس کی بھی کئی اقسام محدثین نے بیان فرمائی ہیں۔ (۱)

۲-متن حدیث میں صحابی یا غیر صحابی کا کوئی کلام ملادے،ایسی حدیث ''مدرج المتن'' کہلاتی ہے۔

۳-راویوں میں تقدیم یا تاخیر کے سبب مخالفتِ ثقات ہو، جیسے مرہ بن کعب کو کعب بن مرہ کہدیا،اسکو مقلوب کہا جاتا ہے۔اور یہ تقدیم وتاخیر کبھی متن میں بھی ہوتی ہے۔

۴-اگر مخالفت اس طرح ہوئی کہ سند میں کسی راوی کا اضافہ ہوگیا،تو ایسی حدیث کو''مزید فی متصل الاسناد'' کہتے ہیں۔

۵-اگر مخالفت بایں طور ہوئی کہ راوی کو بدل دیا اور کوئی وجہ ترجیح بھی نہ ہو، تو وہ حدیث مضطرب کہلاتی ہے، اور یہ کبھی ایک راوی سے ہوتا ہے اور کبھی ایک جماعت کی طرف سے ہوتا ہے، اور یہ موجب ضعف حدیث ہے۔علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

”الاضطراب موجب ضعف الحديث لإشعاره بأنه لم يضبط“. (۲)

اگر کسی وجہ ترجیح سے اس اضطراب کو دور کردیا جائے تو پھر روایت مضطرب نہیں کہلاتی۔علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) دیکھو: نزہۃ النظر: ۶۵ (۲) ارشاد طلاب الحقائق: ۲۵۴/۱

" فإن ترجحت إحدى الروايتين بحيث لا تقاومها الأخرى لكون راويها أحفظ أوأكثر صحبةً للمروي عنه أوغيره من وجوه الترجيح المعتمدة فالحكم للراجح ، ولا يطلق عليه حينئذ وصف الاضطراب ولا له حكمه. (۱)

(یعنی اگر دو روایتوں میں سے ایک راجح ہو اس طرح کہ دوسری روایت اس کے برابر کی نہ رہے، اس کے راوی کے احفظ ہونے یا جس سے روایت کر رہا ہے اس سے کثیر الصحبۃ ہونے کی وجہ سے یا دیگر کوئی وجہ ترجیح کی بنا پر جو معتمد وجوہ ترجیح میں سے ہے، تو پھر حکم راجح کو حاصل ہوگا اور اس وقت اس پر اضطراب کا وصف بھی نہیں بولا جائے گا اور نہ ہی اس کا حکم ہوگا)

۶- اگر مخالفت اس طرح ہوئی کہ کسی لفظ کے نقطوں میں تغیر کر دیا، تو اس کو "مُصَحّف" کہتے ہیں، جیسے ابن مراجم (بالجيم المعجمة) کو ابن مزاحم (بالحاء المهملة) کہہ دیا، یا جیسے "احتجر" (بالراء المهملة) کو "احتجم" (بالميم) پڑھ دیا وغیرہ۔

۷- اور اگر لفظ کی شکل میں تغیر کر دیا ہو تو اسکو تحریف اور ایسی حدیث کو "مُحَرّف" کہتے ہیں جیسے کسی نے کہا" عن رسول الله عن جبريل عن الله عن رجل '' حالانکہ یہ " عن رجل "نہیں بلکہ " عزو جل "تھا، بھلا اللہ تعالے کسی رجل سے کیسے روایت کرتا؟

اکثر محدثین تحریف و تصحیف کو ایک ہی فصل میں بیان کرتے ہیں اور دونوں صورتوں کے لئے ''تصحیف'' کا لفظ ہی استعمال کر لیتے ہیں اور اس تصحیف کی چھ

---

(۱) ارشاد طلاب الحقائق: ۲۴۹/۱

شکلیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) تصحیف فی الاسناد جیسے "ابن مراجم" کو "ابن مزاحم" روایت کرنا۔

(۲) تصحیف فی المتن جیسے "احتجر" کو "احتجم" پڑھنا۔

(۳) **تصحیف البصر** جیسے یعنی آنکھوں سے چوک ہو جانا جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں ہوا ہے۔

(۴) تصحیف السمع جیسے "احول" کو "احدب" سن لیا گیا۔

(۵) تصحیف اللفظ جیسے اوپر کی مثالوں میں اسی کو بتایا گیا ہے۔

(۶) تصحیف المعنی جیسے اس کی مثال جیسے قبیلۂ عنزہ کے ایک شخص نے کہا کہ حضور علیہ السلام نے ہماری طرف نماز پڑھی، یہ اس نے اس حدیث سے تصحیف کیا جس میں ہے کہ حضور ﷺ نے عنزہ (نیزہ) کی طرف نماز پڑھی، تو عنزہ سے اس نے قبیلہ عنزہ مراد لیا۔ (۱)

(۸) جہالتِ راوی: ضعف حدیث کا آٹھواں سبب راوی کا مجہول ہونا ہے۔ اور محدثین کی اصطلاح میں جہالت کی دو قسمیں ہیں: ایک جہالت العین، ایک جہالت الوصف۔

جہالت العین یہ ہے کہ اصحاب الحدیث اس کو نہ جانیں کہ وہ کون ہے؟ اور اس کی حدیث بھی صرف ایک راوی سے معروف و معلوم ہو۔

اور جہالت الوصف یہ ہے کہ دو یا زیادہ راوی اس سے روایت کریں، مگر اسکی

---

(۱) ان اقسام کی تفصیل مع امثلہ کے لیے دیکھئے مقدمہ ابن الصلاح: ۱۲۰-۱۲۲، معرفۃ علوم الحدیث: ۱۸۱-۱۸۹، ارشاد طلاب الحقائق: ۲/۵۶۶-۵۷۰، تدریب الراوی: ۲/۲۷

توثیق نہ کی گئی ہو، اسی کو مستور کہتے ہیں۔ (۱)

مجہول کی ایک تیسری قسم یہ ہے کہ راوی معروف العین ہو، یعنی اس سے دو یا زیادہ محدثین روایت کریں، مگر ظاہراً و باطناً دونوں طرح وہ مجہول الوصف ہو۔ (۲)

ان کے احکام اور اس بارے میں اختلاف وتفصیل آگے آرہی ہے۔

(۹) **بدعت**: یعنی راوی بدعت میں مبتلا ہو تو اس کی روایت بھی ضعیف ہوتی ہے۔

بدعت دو قسم پر ہے: ایک وہ جس سے کفر لازم آتا ہے، اس بدعت کے مرتکب وحامی کی روایت جمہور کے نزدیک مردود ہے۔ اور دوسری قسم وہ بدعت جس سے کفر لازم نہیں آتا ہے بلکہ فسق لازم آتا ہے۔ اس میں محدثین کا اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک اس بدعتی کی روایت جو اپنی بدعت کا داعی نہ ہو، مقبول ہے اور داعی ہو تو مردود ہے۔ (۳)

(۱۰) سوئے حافظہ: اس سے مراد یہ ہے کہ حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے غلطی کرے اور اس کی غلطیاں غالب ہوں۔

پھر اس کی دو اقسام ہیں:

(۱) کبھی تو یہ بڑھاپے کی وجہ سے یا آنکھوں کی بینائی جاتے رہنے سے یا وہ کتابوں پر اعتماد کرکے روایت کرتا تھا، پس کتابیں ضائع ہوگئیں اس کی وجہ سے سوئے حافظہ کا شکار ہوا، تو اس کو طاری کہا جاتا ہے اور ایسا راوی "مختلط" کہلاتا ہے۔

(۲) کبھی سوئے حافظہ ہر حال میں راوی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بعض محدثین

---

(۱) نزہۃ النظر: ۵۷، مقدمہ ابن صلاح: ۴۴ (۲) ارشاد طلاب الحقائق: ۲۹۲/۱، الفیہ العراقی: ۵۷، تقریب: ۳۱۶/۱ (۳) نزہۃ النظر: ۵۷-۷۷، مقدمہ ابن صلاح: ۴۵، ارشاد طلاب الحقائق: ۳۰۲/۱

اس کی روایت کو شاذ کہتے ہیں۔ (۱)

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے حدیث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے، مگر ان میں سے بعض کے بارے میں حضرات فقہاء ومحدثین کا اختلاف ہے اور بعض کے بارے میں خود محدثین ہی مختلف الخیال ہیں۔ ذیل میں ان کی بحث نقل کی جاتی ہے۔

اسباب جرح اور فقہاء کرام

حدیث مرسل کا حکم

حدیث مرسل کے بارے میں جمہور محدثین کی رائے یہ ہے کہ وہ نا قابل اعتبار ہے، اسی لیے وہ اس کو مردود کے اقسام میں شمار کرتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے حتی کہ بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ دور اول میں مرسل سے احتجاج ہی جمہور کا مسلک رہا ہے اور سب سے پہلے جنہوں نے اس کو نا قابل احتجاج قرار دیا، وہ امام شافعی ہیں۔

امام ابوداؤد نے اہل مکہ کے نام جو خط لکھا تھا، اس میں وہ فرماتے ہیں:

"اما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء في ما مضى مثل سفيان الثوري ومالك والاوزاعي حتى جاء الشافعي فتكلم فيه وتابعه على ذلك أحمد بن حنبل وغيره". (۲)

اور امام ابن جریر الطبری نے کہا کہ:

"وأجمع التابعون بأسرهم على قبول المرسل ولم يأ ت عنهم إنكاره ولا عن أحد من الائمة بعدهم إلى رأس المأ تين، قال ابن عبدالبر: كأنه

(۲) نزہۃ النظر: ۵۷، مقدمۃ ابن الصلاح: ۴۴ (۲) رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکۃ: ۲۴

يعني أن الشافعي أول من رده."(١)

اگر چہ یہ اجماع کا دعویٰ محل نظر ہے جیسا کہ حافظ نے "النکت علی ابن الصلاح" میں اور حافظ سخاوی نے "فتح المغیث" میں لکھا ہے۔ تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جمہور تابعین کے نزدیک مرسل کو قابل احتجاج سمجھا جاتا تھا۔

مالکیہ نے امام مالک کا مذہب یہی لکھا ہے کہ وہ مرسل کو حجت قرار دیتے تھے۔(٢)

اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے، ابن الصلاح نے فرمایا کہ:

"والاحتجاج به مذهب مالك وأبي حنيفة وأصحابهما رحمهم الله في طائفة"۔(٣)

اور امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"وقال مالك وأبوحنيفة وأصحابهما وطائفة من العلماء يحتجّ به۔"(٤)

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ:

تابعین اور تبع تابعین کے مرسلات مقبول ہیں اور اس کے بعد والوں کے مرسلات قابل قبول نہیں، الّا یہ کہ راوی کی عادت ہو کہ وہ صرف ثقہ سے روایت کرتا ہو، تب اس کی مرسل حدیث قبول کی جاسکتی ہے۔

علامہ ابن الحنبلی "قفوالاثر" میں فرماتے ہیں:

"والمختارفي التفصيل قبول مرسل الصحابی مطلقاً ومرسل أهل

---

(١) تدریب الراوی: ١/١٩٨ (٢) التمهيد لابن عبدالبر: ١/٢ (٣) مقدمۃ ابن الصلاح: ٢٢

(٤) ارشاد الطلاب: ١/١٧٢

القرن الثاني والثالث عندنا (أي الحنفية) وعند مالك مطلقاً ـــــــ وأما مرسل من دون هؤلاء فمقبول عند بعض أصحابنا، مردود عند آخرين إلا أن يرويَ الثقات مرسلَه كما روَوُا مسندَه ، فإن كان الراوي يرسل عن الثقات وغيرهم فعن أبي بكر الرازي من أصحابنا وأبي الوليد الباجي من المالكية عدم قبول مرسله إتفاقاً۔" (۱)

(اس مسئلہ کی تفصیل میں مختار قول یہ ہے کہ صحابی کی مرسل حدیث مطلقا اور دوسرے اور تیسرے قرن کی مرسل حدیث (حنفیہ کے نزدیک) قابل قبول ہے، اور امام مالک کے نزدیک بھی مطلقاً مقبول ہے، اور رہیں ان کے بعد والوں کی مرسل حدیثیں تو وہ ہمارے بعض اصحاب کے نزدیک مقبول ہیں اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک مردود ہیں مگر یہ کہ اس راوی کی مرسل حدیث ثقہ حضرات روایت کریں جیسے اس کی مسند روایت کرتے ہیں، پس اگر راوی ایسا ہے کہ ثقہ وغیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہو تو ہمارے اصحاب میں سے ابوبکر رازی سے اور مالکیہ میں سے ابوالولید باجی سے مروی ہے کہ بالاتفاق اس کی مرسل حدیث نامقبول ہے)

امام بزدویؒ "كنزالاصول الى معرفة الاصول" میں فرماتے ہیں:

"وأما إرسال القرن الثاني والثالث فحُجّة عندنا،وهوفوق المسند، كذا ذكره عيسى بن أبان وأما إرسال من دون هؤلاء فقد اختلف فيه ، فقال بعض مشائخنا يُقبَلُ إرسال كلّ عدل، وقال بعضهم لايُقبَلُ، أما وجه الأول فما ذكرنا ، وأما الثاني فلأن الزمان زمان فسق فلابدّ من البيان إلا أن يرويَ الثقات مرسلَه كماروَوُا مسندَه مثل إرسال محمد بن حسن"۔ (۲)

(۱) قفوالاثر :۱/۷٦ (۲) اصول بزدویؒ :۱/۱۷۱-۱۷۳

اورامام حسام الدینؒ نے فرمایا:

"فالمُرسل من الصحابي محمول على السماع ، ومن القرن الثاني والثالث على أنه وضح له الأمر واستبان له الإسناد ، وهوفوق المسند فإن من لم يتّضح له الأمر نسبه إلى من سمعه منه ليحمله ما تحمل عنه لكن هذا ضرب مزية يثبت بالاجتهاد فلم يجز النسخ بمثله ، وأما مراسيل من دون هولاء فقد اختلف فيه إلا أن يرويَ الثقات مرسلَه كما رَوَوُا مسندَه۔"(۱)

ان عبارت سے مستفاد ہوا کہ احناف کے نزدیک:

(۱) ایک صحابی دوسرے صحابی سے جو حدیث مرسلاً بیان کرے وہ باتفاق علماء مقبول ہے۔

(۲) قرن تابعین وتبع تابعین کی مرسل احادیث بھی مطلقاً مقبول اور حجت ہیں۔

(۳) اس کے بعد کے لوگوں کی مرسل حدیث کے بارے میں احناف میں اختلاف ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ہر عادل وثقہ کی مرسل حدیث مقبول ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ چونکہ قرون مشہود لہا بالخیر کے بعد کذب اور فسق پھیلا ہوا تھا، لہٰذا بعد کے دور کی مرسل حجت نہ ہوگی۔

(۴) لیکن اگر بعد کے دور کی مرسل حدیث کو ثقات ولائق اعتماد محدثین روایت کریں جس طرح اس راوی کی مسند روایت کو روایت کرتے ہیں، تو وہ بھی باتفاق احناف مقبول وحجت ہے۔

اورامام شافعیؒ بھی مطلقاً مرسل حدیث کو رد نہیں فرماتے بلکہ بعض شرائط کے ساتھ ان کے نزدیک وہ حجت ہے۔ ان شرائط کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مرسل کی تقویت کسی مسند حدیث سے ہو۔

---

(۱) منتخب حسامی مع شرح النامی: ۱/۱۳۶۔۱۳۷

(۲) مرسل کی تقویت کسی اور مرسل حدیث سے ہو جو دوسرے راوی سے آئے۔

(۳) بعض صحابہ کا قول اس مرسل حدیث کے موافق ہو۔

(۴) اکثر اہل علم کا قول اس کے موافق ہو۔

امام نوویؒ مقدمہ ''شرح مسلم'' میں لکھتے ہیں:

''ومذهب الشافعي أنه إذا انضمّ إلى المرسل ما يعضده احتجّ به ، وذلك بأن يُرْوٰى أيضاً مُسنَداً أومرسلاً من جهة أخرى أو يعمل به بعضُ الصحابة أو أكثرالعلماء۔''(۱)

حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے فرمایا کہ:

''واحتج بالمرسل أبوحنيفة وأصحابه ومالك وأصحابه ، وكذا الشافعي وأحمد وأصحابهما إذا اعْتُضِدَ بمُسُند آخر أو مرسل آخر بمعناه عن آخر ، فيَدُلّ على تعدُّد المخرج أو وافقه قول بعض الصحابة أو قال به أكثر أهل العلم۔''(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ وامام مالک اوران کے اصحاب کے نزدیک قرن ثانی وثالث کی حدیث مرسل تو مطلقاً مقبول ہے اوراس کے بعد کی وہ مرسل بھی مقبول ہے جس کو ائمہ ثقات روایت کریں،اورامام شافعی واحمد کے نزدیک چار شرائط سے جن کا اوپر ذکر ہوا،مرسل حدیث مقبول ہے،اوراسی وجہ سے امام شافعیؒ نے سعید بن مسیّب کی مراسیل کومقبول فرمایا ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے ''ارشادالطلاب''میں اورابن الصلاح نے'' مقدمہ'' میں امام سیوطی نے تدریب الراوی میں اور دیگر حضرات نے بھی لکھا ہے۔(۳)

(۱)مقدمہ شرح مسلم:۱/۱۷(۲)نقلہ ابوغدہ عبد الفتاح فی تعلیقہ علی مقدمۃ اعلاء السنن:۱/۸۸

(۳)ارشادالطلاب:۱/۱۷۱،مقدمہ ابن الصلاح:۲۲،تدریب الراوی:۱/۱۹۹

حدیث منقطع کا حکم

حدیث منقطع کے بارے میں محدثین وفقہاء کا اختلاف ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ ضعیف ہے اور نا قابل اعتبار، اور فقہاء کے نزدیک قرن ثالث کا انقطاع مقبول ہے جیسا کہ اوپر کی عبارت میں گزر چکا؛ کیونکہ اوپر جہاں جہاں قرن ثالث کے ارسال کا ذکر ہے، اس سے محدثین کی اصطلاح میں منطقع مراد ہے؛ کیونکہ عام طور پر فقہاء واصولیین منقطع کو بھی مرسل کہہ دیا کرتے ہیں۔ بہرحال فقہاء احناف اور مالکیہ کے نزدیک تبع تابعین کے دور کا انقطاع مقبول ہے اور اس کے بعد کے انقطاع کے لیے وہی شرط ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ ثقات اس راوی کی منقطع روایت کو بھی مسند کی طرح روایت کریں۔

تدلیس اور فقہاء کرام

تدلیس کے بارے میں اوپر محدثین کا اختلاف اور اس کے بارے میں ان کا صحیح نظریہ اور قول ذکر کیا جا چکا ہے، وہ یہ کہ اکثر محدثین اس کے قائل ہیں کہ مدلس راوی اگر ایسے الفاظ سے روایت کرتا ہے جو سماع پر دلالت کرتے ہیں تو وہ روایت مقبول ہوگی، بشرطیکہ وہ ثقہ ہو ورنہ نہیں۔

مگر حضرات فقہاء کے نزدیک تدلیس کوئی سبب جرح وضعف نہیں ہے۔ فخر الاسلام بزدویؒ نے فرمایا کہ:

”ومن ذلك طعنه بالتدليس، وذلك أن تقول حدّثني فلان عن فلان من غير أن يتّصل الحديث بقوله حدّثنا أوأخبرنا، وسمّوه عنعنةً ؛ لأن هذا يوهم شبهة الإرسال وحقيقته ليس بجرح فالشبهة الأولى۔“(۱)

---

(۱) اصول بزدوی: ۱۸: ۱۷

(یعنی طعن مردود میں سے محدثین کا تدلیس سے طعن کرنا بھی ہے،اور تدلیس یہ ہے کہ یوں کہے ''حدّثني فلان عن فلان'' بغیر اس کے کہ حدیث کو'' أخبرنا'' یا''حدّثنا'' کہہ کر متصل کرے، اور محدثین اس کو عنعنہ کہتے ہیں۔ یہ طعن مردود اس لیے ہے کہ اس سے روایت کے منطقع ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے،اور جب حقیقت انقطاع بھی جرح نہیں تو شبہ انقطاع تو بدرجہ اولیٰ جرح نہیں ہوگا)

اور''نورالانوار''میں ہے:

"لایُقبَلُ الطعنُ بالتدلیس------- لأن غایته أنه یوهم شبهة الإرسال ، وحقیقة الإرسال لیس بجرح فشبهته أولی۔"(۱)

غرض یہ کہ فقہاء احناف کے نزدیک تدلیس جرح نہیں ہیں،لیکن اس کے قبول کرنے کے لیے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ قرون ثلاثہ کے ثقات کی تدلیس تو مقبول ہے۔ اور قرون ثلاثہ کے بعد کی تدلیس میں وہی تفصیل ہے جو ارسال میں گزری۔ ''قفوالاثر''میں احناف کا مسلک اس طرح نقل فرمایا کہ:

"وأما عندنا (معشرالحنفیة) فقیل لمرویّه (أي المدلِّس) حکمُ المرسل وقد علمتَ حکمَه۔"(۲)

اس کو نقل کر کے مولانا ظفر احمد عثانی فرماتے ہیں:

"قلتُ: فإن کان المدلِّس من ثقات القرون الثلاثة یُقبَلُ تدلیسُه کإرساله مطلقاً وإن کان ممّن دون هؤلاء ففیه تفصیل قد مرّ". (۳)

خلاصہ یہ ہوا کہ جو حدیث مرسل کا حکم ہے، احناف کے نزدیک حدیث مدلس کا بھی وہی حکم ہے۔

---

(۱)نورالانوار:۱۹۶/۶ (۲)قفوالأثر:۲/۱۷ (۳)مقدمہ اعلاء السنن:۹۸/۱

جہالت راوی: اقسام واحکام

محدثین نے جہالت راوی کی تین اقسام قرار دی ہیں:(۱)

(۱) جہالت عین: وہ یہ ہے کہ راوی سے ایک سے زائد روایت کرنے والا نہ ہو، اگر ایک سے زیادہ اس سے روایت کرنے والے ہوں تو وہ مجہول العین نہ رہے گا۔

(۲) جہالت عدالت ظاہراً وباطناً: اور وہ یہ ہے کہ راوی کا ثقہ وقابل اعتماد ہونا نہ ظاہراً معلوم ہو نہ باطناً، اگر چہ اس سے دو راوی روایت کرتے ہوں۔

(۳) جہالت عدالت باطناً: یعنی راوی کا ثقہ ہونا باطناً تو معلوم نہ ہو، لیکن ظاہر حال سے عدل وثقہ معلوم ہو۔ اسی کو مستور الحال کہتے ہیں۔

علامہ نوویؒ نے مقدمہ ''شرح مسلم'' میں لکھا ہے کہ:

دوسری قسم یعنی مجهول العدالۃ ظاہراً وباطناً کی روایت جمہور کے نزدیک نا قابل قبول ہے، لیکن باقی دو یعنی مجهول العین اور مجهول العدالۃ ظاہراً جس کو مستور کہتے ہیں، ان کی روایت سے اکثر محققین نے احتجاج کیا ہے۔(۲)

علامہ ابن الصلاحؒ نے مستور کے بارے میں مقبول ہونے کا قول ذکر کر کے فرمایا کہ:

” قلتُ: يشبه أن يكون العمل على هذا الرأي في كثير من كتب الحديث المشهورة في غير واحد من الرواة الذين تقادم العهد بهم وتعذرت الخِبرة الباطنة بهم.“(۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستور کی روایت کا مقبول ہونا جمہور کا مسلک ہے

---

(۱) دیکھئے ارشاد الطلاب: ۲۹۲/۱، مقدمہ شرح مسلم للنوویؒ: ۱۷، توضیح الافکار: ۱۸۵/۲ (۲) مقدمہ شرح مسلم: ۱۷ (۳) مقدمۂ ابن الصلاح: ۴۴

اورعموماً اسی پرعمل بھی ہے۔ اور فقہاء کرام میں سے احناف کا مسلک مستور کے بارے میں یہ ہے کہ قرون مشہود لہا بالخیر کے مستور راوی کی حدیث مقبول وحجت ہے اوراس کے بعد کے ادوار کی نہیں۔ چنانچہ ''حسامی'' ہے کہ:

"والمستور کالفاسق لایکون خبره حجةً في باب الحدیث مالم یظهر عدالته إلا في الصدر الأول"

حسامی کی شرح ''النامی'' میں علامہ عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:

" أي لایکون خبر المستور حجةً في جمیع الصدور إلا في الصدرالأول، وأراد به قرن الصحابة والتابعین، فخبر المستور من القرون الثلاثة یکون حجةً بشروط." (۱)

اس طرح ''قفوالاثر'' میں ہے، ولفظه هذا:

"واماالمستورعندنا من کان عدلاً فی الظاهر ولم تعرف عدالته فی الباطن سواء انفرد بالروایة عنه واحد ام روی عنه اثنان فصاعداً فحکم حدیثه الانقطاع الباطن وعدم القبول الا فی الصدر الاول." (۲)

مگر بعض کتب حنفیہ میں اس کے خلاف دواقوال اور ملتے ہیں۔ ''اصول الآمدی'' میں مطلقاً مستور کی حدیث کا مقبول ہونا مذکور ہے اور ملاعلی قاری نے بھی شرح النخبہ میں اس کونقل کیا ہے۔ (۳)

اوردوسرا قول مطلقاً نا مقبول ہونا ہے، امام بزدویؒ نے غالبًا اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"والمطلق من العدالة ینصرف إلی أکمل الوجهین فلهذا لم یجعل خبر الفاسق والمستور حجةً". (۴)

---

(۱) حسامی مع النامی :۱/۱۴۳ (۲) قفو الاثر:۱/۸۶ (۳) مقدمہ اعلاء السنن ۱/۱۲۷ (۴) اصول بزودی:۱۶۶

اس کے بعد امام بزدوی کی ایک عبارت ملی جو اوپر کے مسلک ہی کی ترجمانی کرتی ہے اور غالبًا کا لفظ بندہ نے اسی احتمال کی بنیاد پر لکھا تھا کہ کسی اور عبارت میں وضاحت ہو سکتی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے: والصحیح ما حکاہ محمد أن المستور کالفاسق لا یکون خبرہ حجةً حتی یظھر عدالتہ، وھذا بلا خلاف في باب الحدیث احتیاطاً إلا في الصدر الاول. (۱)

احناف کا معتدل مسلک وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ قرون خیر کے مستور کی حدیث حجت ہے اور اس کے بعد والوں کی حجت نہیں۔

رہا مجہول العین، اس کے بارے میں احناف کے مسلک کا خلاصہ یہ ہے کہ مجہول العین پانچ قسم پر ہے۔

(۱) سلف صالحین اس سے روایت کریں۔

(۲) یا بعض لوگ اس کی حدیث قبول کریں اور بعض قبول نہ کریں۔

(۳) یا اس کے بارے میں خاموش رہیں، طعن و جرح نہ کریں۔

ان تینوں صورتوں میں مجہول العین راوی معروف کی طرح ہوگا اور اس کی حدیث قابل قبول ہوگی۔

(۴) اور اگر سلف کے زمانہ میں اس پر رد ہو گیا تو وہ روایت مستنکر ہوگی۔

(۵) اور اگر سلف کے دور میں اس کی حدیث ظاہر ہی نہ ہوئی اور نہ اس کا رد ہوا اور نہ قبول، تو اس کی حدیث جائز العمل ہوگی، واجب العمل نہ ہوگی۔ (۲)

مگر یاد رہے کہ اوپر کی تین صورتوں میں جو مجہول العین کی حدیث کو حجت و مقبول مانا گیا ہے، یہ اس شرط سے مشروط ہے کہ صدر اول یعنی صحابہ یا تابعین یا تبع

---

(۳) اصول بزدوی: ۱۷۷ (۲) دیکھو نور الانوار: ۱۸۴-۱۸۵، حسامی مع شرحہ النامی: ۱/۱۵۰-۱۵۱، اصول بزدوی: ۱۶۰

تابعین کے دور میں ہو،اس کے بعد کے ادوار کے مجہول العین راوی کی حدیث کلیۃً مردود ہے۔ چنانچہ امام بزدویؒ نے صدر اول کی شرط لگائی ہے،وہ فرماتے ہیں:

والجواب أن خبرالمجهول من الصدر الأول مقبول عندنا على الشرط الذى قلنا (أي من قبل من رواية السلف عنه أو الاختلاف فيه أوالسكوت عنه) بشهادة النبي عليه السلام على ذلك القرن بالعدالة ."(۱)

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"حتى أن رواية مثل هذا المجهول في زماننا لا تحِلُّ العمل به لظهور الفسق." (۲)

غرض یہ کہ احناف کے نزدیک مجہول العین بھی صدر اول میں مقبول ہے جبکہ وہ تین شرطیں پائی جائیں جواوپر مذکور ہوئیں۔ اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جائیں تو حجت نہیں اور سلف کے دور کے بعد کی مجہول کی حدیث پر عمل جائز نہیں۔

بدعت: اقسام واحکام

علماء نے بدعت کی دو قسمیں کی ہیں: ایک بدعتِ مُکَفِّرہ، دوسری بدعتِ مُفَسِّقہ، یعنی ایک وہ بدعت ہے جس کے ارتکاب سے کفر لازم آتا ہے جیسے بعض غالی روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ میں اللہ کی ذات حلول کر گئی ہے یا قرآن پاک میں تحریف ہوگئی ہے وغیرہ۔ دوسری بدعت وہ جس سے فسق لازم آتا ہے جیسے دیگر فرقِ باطلہ کے بہت سے عقائد واعمال ہیں۔

بدعت مکفرہ کے مرتکب کی حدیث کے بارے میں محدثین کے اقوال مختلف ہیں، جمہور نے اس کی حدیث کو رد کیا ہے اور بعض نے اس کی حدیث کو علی الاطلاق مقبول قرار دیا ہے اور بعض نے اس میں تفصیل کی ہے کہ اگر یہ راوی اپنے اس باطل

---

(۱) اصول بزدوی: ۱۶۷ (۲) اصول بزدوی: ۱۶۰

مذہب ومسلک کی تائید ونصرت کے لئے جھوٹ کو حلال سمجھتا ہو تو اس کی حدیث قبول نہ کی جائے گی اور اگر اس بارے میں بھی جھوٹ کے مباح و جائز ہونے کا عقیدہ نہ رکھتا ہو تو اس کی حدیث مقبول ہوگی۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بدعت مکفرہ کے مرتکب کے بارے میں اختلاف ہے، لہٰذا امام نوویؒ نے جو اس کی روایت کے مقبول نہ ہونے پر اتفاق نقل کیا ہے، یہ محل نظر ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

"المبتدع يكفر ببدعته لاتُقبَل روايته بالاتفاق" (۲)

مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اگرچہ جمہور کا مسلک ہے تاہم اس میں اتفاق کا دعوی مشکل ہے کیونکہ اس میں اور بھی اقوال ہیں۔ (۳)

حافظ ابن حجرؒ نے اس کے بارے میں ایک اور نظریہ اختیار فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ جس بدعت کی وجہ سے وہ راوی شرع کے کسی ایسے امر کے انکار کا مرتکب ہو جو دین میں متواتر طور پر ثابت ہو اور ضروریات دین میں سے ہو، اس کی روایت قابل قبول نہ ہوگی اور جو ایسا نہ ہو اور اس کے ساتھ ضبط واتقان اور ورع وتقوی کا حامل ہو، اس کی روایت کے قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں:

"فالمعتمد أن الذي تُردّ روايته من أنكر أمراً متوتراً من الشرع معلوماً من الدين بالضرورة ، وكذا من اعتقد عكسه ، فأما من لم يكن بهذه الصفة وانضم إلى ذلك ضبطه لما يرويه مع ورعه وتقواه فلامانع من قبوله". (۴)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بدعت علماء کے نزدیک موجب کفر ہو، اس کے حامی

(۱) نزھۃ النظر :۶۷ (۲) ارشاد الطلاب :۱/۳۰۰ (۳) دیکھو: الکفایہ :۱۲۱، تدریب :۱/۳۲۴
(۴) نزہۃ النظر :۶۷

کی روایت مردود ہے اور جو بدعت باتفاق علما موجب کفر نہ ہو بلکہ اس کے موجب کفر ہونے میں اختلاف ہو، اس کے حامل وحامی کی روایت مقبول ہوسکتی ہے جب کہ ضبط واتقان اور ورع وتقوی اس میں ہو۔

رہی وہ بدعت جو موجب فسق ہے، اس میں بھی اختلاف کیا گیا ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"واختلفوا فيه إذا لم يكفر، فمنهم من ردّها مطلقاً لفسقه ولاينفعه التأويل، ومنهم من قَبِلَهَا إذا لم يكن ممّن يستحلّ الكذب في نصرة مذهبه أو لاهل مذهبه سواء كان داعيةً إلى بدعته أو لم يكن----و منهم من قال تُقبَلُ روايتُه إذا لم يكن داعيةً إلى بدعته ولايُقبَلُ إذا كان داعيةً". (۱)

(علماء نے بدعتی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جبکہ اسکی تکفیر نہ کی گئی ہو، بعض نے اس کی روایت کو اس کے فاسق ہونے کی بنا پر مطلقاً رد کیا ہے، اور اس کی تاویل سے اس کو کچھ نفع نہیں، اور بعض نے اس کی روایت کو اس وقت قبول کیا ہے جبکہ وہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جو اپنے مذہب کی اور اپنے اہل مذیب کی تائید کے لیے جھوٹ کو حلال سمجھتے ہیں، خواہ وہ اپنی بدعت کا داعی ہو یا نہ ہو، اور بعض نے کہا کہ اس کی روایت اس وقت مقبول ہے جبکہ وہ اپنی بدعت کا داعی نہ ہو، اور اگر اپنی بدعت کا داعی ہو تو اس کی روایت قابل قبول نہیں)

اس میں سے پہلا قول کہ مطلقاً بدعتی کی روایت مردود ہے، حضرت امام مالکؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ خطیب نے لکھا ہے اور اس قول کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ تاویل سے کفر اور فسق کرنے والا، کافر معاند وفاسق عامد کے برابر ہے، لہٰذا ان دونوں کی حدیث قبول نہ کرنا اور ان کی روایت کو ثابت نہ ماننا واجب ہے۔ (۲)

---

(۱) ارشاد الطلاب: ۱/۳۰۲ (۲) الکفایہ: ۱۲۰

اور دوسرا قول کہ اُس بدعتی کی روایت مقبول ہے جو اپنے مذہب یا اہل مذہب کی تائید ونصرت کے لئے جھوٹ کو حلال نہ سمجھتا ہو، یہ امام شافعی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور آپ سے متعدد حضرات نے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا کہ ''میں سوائے خطابیہ کے تمام اہل اہواء کی شہادت قبول کرتا ہوں ؛ کیونکہ یہ خطابیہ اپنی موافقت کے لئے جھوٹ کو جائز سمجھتے ہیں۔ (۱)

اور تیسرا قول کہ اگر وہ راوی اپنی بدعت کا داعی ہو تو مردود ہے اور داعی نہ ہو تو مقبول ہے، اس کو حافظ ابن حجرؒ نے اصح اور علامہ ابن الصلاحؒ وعلامہ نوویؒ نے کثیر یا اکثر علماء کا مذہب اور امام ابن حبان نے اجماعی مذہب قرار دیا ہے۔ (۲)

اگرچہ ابن حبان کے دعوی اجماع پر کوئی دلیل نہیں اور خلاف تحقیق ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ پھر اس قول کے قائلین کے مابین بھی اختلاف ہے، بعض حضرات مطلقاً ہر اس بدعتی کی راویت کو مقبول قرار دیتے ہیں جو اپنی بدعت کا داعی نہ ہو، لیکن بعض حضرات نے اس میں بھی قید لگائی ہے، وہ یہ کہ اس کی روایت وحدیث ایسی نہ ہو جس سے اس کی بدعت کو تقویت وتائید ملے۔ ابن حجرؒ نے اسی دوسرے قول کو مذہب مختار قرار دیا ہے اور فرمایا کہ امام نسائی وابوداؤد کے شیخ ابواسحاق جوزجانی نے اس قید کی تصریح اپنی کتاب میں فرمائی ہے۔ (۳)

اب فقہائے حنفیہ کا مسلک ملاحظہ فرمائیں۔ ''قفو الاثر'' میں نقل کیا ہے:

''وعندنا (أي الحنفية) إن أدت إلى الكفر لم تُقبَلُ رواية صاحبها

---

(۱) ارشاد الطلاب: ۱/۳۰۲، مقدمہ ابن الصلاح: ۴۵، مستصفی للغزالی: ۱/۱۰۲ (۲) نخبۃ الفکر: ۴، مقدمہ ابن الصلاح: ۴۵، ارشاد الطلاب: ۱/۳۰۲، نزہۃ النظر: ۷۶، مقدمہ فتح الباری: ۳۸۵، لسان المیزان: ۱/۲۱، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی: ۹۳، منہاج السنۃ: ۱/۱۴ (۳) شرح النخبہ: ۷۸، ہدی الساری: ۳۸۵، لسان المیزان: ۱/۲۱

وفاقاً لأكثر الأصوليين، وإن أدت إلى الفسق ، فقيل : قبلت رواية صاحبها إذا كان عدلاً ثقةً غيرَ داعيةٍ وقيل إذا كان فسقه مظنونا أو مقطوعا به ولم يتدين الكذب ،زاد فخر الإسلام فقال: ولم يدع إلى بدعته ، والمختار هو الأول". (۱)

(ہمارے نزدیک اگر بدعت کفر تک پہنچاتی ہوتو اس کی روایت اکثر اصولیین کے اتفاق سے نا قابل قبول ہے،اوراگر وہ کفر تک نہ پہنچائے تو اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اگر وہ شخص عادل وثقہ ہواوراپنی بدعت کا داعی نہ ہوتو اس کی روایت مقبول ہےاوردوسراقول یہ ہے کہ اس کااس بدعت کی وجہ فسق غالب گمان کے مطابق ہو یا یقینی ہولیکن وہ اپنے مذہب کے لیے جھوٹ بولنےکو دین نہ سمجھتا ہواور فخر الاسلام نے یہ اضافہ بھی کیا ہےوہ اپنی بدعت کا داعی نہ ہوتو اس کی روایت مقبول ہے،اور پہلا قول ہی مختار ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور محدثین کا جومسلک ہے،وہی مسلک حنفیہ نے بھی اختیا رکیا ہے کہ بدعت مکفرہ کے مرتکب وحامی کی حدیث غیر مقبول ہےاور بدعت مفسقہ کے مرتکب وحامی کی حدیث اس شرط سے مقبول ہے کہ وہ عادل وثقہ ہواوراپنی بدعت کا داعی نہ ہو۔امام بزدویؒ نے فرمایا:

"وأما في باب السنن فإن المذهب المختار عندنا أن لايُقبَلَ رواية من انتَحَلَ الهوىٰ والبدعةَ ودَعَا الناس إليه ، على هذا ائمة الفقه والحديث كلّهم ". (۲)

یہی بات علامہ حسام الدین محمد الاخسیکثیؒ نے فرمائی ہے:

(۱)مقدمہ اعلاء السنن:۱/۱۴۱(۲)اصول بزدوی:۱۷۹

''أما صاحب الهوى فالمذهب المختار أنه لايُقبَلُ روايةُ منِ انُتَحلَ الهوٰى و دَعَاالنّاسَ إليه ، وهو مذهب عامة أهل الفقه والحديث .''(۱)

حافظ ابن حجر نے امام ابوحنیفہؒ وامام ابو یوسف کی طرف اس قول کو منسوب کیا ہے کہ وہ بدعت جس سے کفر لازم نہ آئے اوراس کا مرتکب جھوٹ کو حلال نہ سمجھتا ہو تو اس کی حدیث مقبول ہے، یہ وہی قول ہے جو امام شافعی سے اوپر نقل کیا گیا۔(۲)

غالباً یہ ان حضرات سے ایک قول منقول ہے اور مذہب وہی ہے جو اوپر نقل کیا گیا۔ واللہ اعلم

حدیث ضعیف کا اجمالی حکم

حدیث ضعیف جس کی تعریف اوپر ذکر کی گئی، اس کا حکم کیا ہے؟ اس سلسلہ میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ضعیف کی وہ قسم جس کو موضوع کہا جاتا ہے، وہ تو باتفاق علماء مردود اور اس کی روایت اور اس سے کسی بھی مسئلہ میں احتجاج جائز نہیں ہے۔

موضوع کو چھوڑ کر مطلق حدیث ضعیف کے بارے میں اختلاف ہے۔ اور تین قول اس بارے میں مشہور ہیں:

(۱) علی الاطلاق حدیث ضعیف نا قابل اعتبار ہے، اس سے نہ احکام وعقائد میں احتجاج جائز ہے اور نہ فضائل ومواعظ میں۔ ابن معین اور ابوبکر ابن العربی سے اس کو نقل کیا گیا ہے اور علماء حدیث کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔(۳)

(۲) ضعیف حدیث پر اسی وقت عمل کیا جا سکتا ہے جب کہ اس باب میں کوئی

---

(۱) حسامی مع النامی: ۱۴۸ (۲) لسان المیزان: ۲۱/۱ (۳) القول البدیع: ۱۹۵، الاجوبۃ الفاضلۃ: ۵۰

اور حدیث سوائے اس حدیث ضعیف کے وارد نہ ہو۔ امام ابوداود کا یہی مذہب ہے اور امام احمد سے بھی یہی منقول ہے اور امام ترمذی اور امام ابوداود کے طرز سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے؛ کیونکہ ان حضرات نے ضعیف حدیث کو اپنی سنن میں روایت کیا ہے اور اس سے احتجاج کیا ہے جب کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث وارد نہ ہو۔ (۱)

امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مذہب ابن القیمؒ نے نقل کیا ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر مقدم رکھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

”وأصحاب أبي حنيفة مجمعون على أن مذهب أبي حنيفة : أن ضعيف الحديث عنده أولى من القياس والرأي ، وعلى ذلك بَنٰى مذهبَه.“ (پھر چند امثلہ کا ذکر کر کے آگے فرماتے ہیں)”فتقديم الحديث الضعيف وآثار الصحابة على القياس والرأي قولُه (أي قول أبي حنيفة) وقول الإمام أحمد“. (۲)

نیز امام مالک کے بارے میں فرمایا کہ:

”وأما مالك فإنه يقدّم الحديث المرسل والمنقطع و البلاغات وقول الصحابي على القياس “. (۳)

نوٹ: یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ امام ابن القیم نے تصریح کی ہے کہ ان حضرات کے کلام میں ضعیف سے مراد حدیث حسن ہے، نہ کہ ضعيف المصطلح عليه عند المتاخرين ،اس پر کلام آگے آرہا ہے۔

نیز امام شافعی کا بھی یہی مذہب نقل کیا گیا ہے۔ (۴)

اور امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ:

---

(۱) النکت علی ابن الصلاح: ۱/۴۲۷، القول البدیع: ۲۵۵ (۲) اعلام الموقعین: ۱/۷۷ (۳) اعلام الموقعین: ۱/۳۱ (۴) اعلام الموقعین: ۱/۷۷

" قال ابن مندة:وكذلك أبوداؤد يأخذ ماخذَه (أي النسائي) ويُخرِجُ الإسناد الضعيف إذا لم يجد في الباب غيرَه لأنه أقوى عنده من رأي الرجال ، وهذا أيضاً رأي الإمام أحمد." (١)

امام شاطبیؒ نے فرمایا کہ:

"فكلام أحمد ومن وافقه دالّ على أن العمل بالحديث الضعيف يُقَدَّمُ على القياس المعمول به عند جمهور المسلمين بل هو إجماع السلف." (٢)

غرض یہ ہے کہ بہت سے ائمہ فقہ وحدیث اس کے قائل ہیں کہ اگر ضعیف حدیث کے سوا باب میں کوئی اور حدیث وارد و ثابت نہ ہو تو وہ قیاس پر راجح ہے، اور قابل عمل ہے۔

(۳) تیسرا مذہب اس سلسلہ میں یہ ہے کہ فضائل اعمال اور مواعظ و قصص اور ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے اور اس کے ضعف کے بیان کر نے میں تساہل سے بھی کام لیا جا سکتا ہے، لیکن عقائد اور حلال وحرام کے احکام میں ضعیف حدیث پر عمل جائز نہیں اور نہ ضعیف حدیث کے بیان میں تساہل جائز ہے۔

خطیب بغدادی نے "الکفایۃ" میں ایک فصل بعنوان:" باب التشديد في أحاديث الأحكام والتجوز في فضائل الأعمال" قائم کی ہے اور اس میں متعدد حضرات محدثین سے احادیث فضائل وترغیب میں تساہل کا جواز نقل کیا ہے، سفیان ثوری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ "لا تأخذوا هذا العلم في الحلال والحرام إلا من الرؤساء المشهورين بالعلم الذين يعرفون الزيادة والنقصان، فلا بأس بما سوا ذلك من المشائخ". (٣)

---

(١) تدریب الراوی:۱/۲۹۷ (۲) الاعتصام:۱/۲۶۲ (۳) الکفایہ:۱۳۴

اور امام احمد سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ " إذا روينا في الحلال والحرام والسنن والأحكام شدّدنا وإذا روينا في فضائل الأعمال وما لا يضع حكما ولا يرفعه تساهلنا في الأسانيد." (۱)

اور ابوزکریا العنبری سے نقل کیا کہ "الخبرُ إذا وَرَدَ لم يُحَرِّمْ حلالاً ولم يُحِلَّ حراماً ولم يُوجِبْ حكماً وكان في ترغيب وترهيب أو تشديد و ترخيص وَجَبَ الإغماضُ عنه والتساهُلُ في روايته. (۲)

علامہ ابن الصلاح اور ان ہی کی اقتداء میں علامہ نووی نے فرمایا کہ:

" يجوز عند أهل الحديث وغيرهم التساهُل في الأسانيد ورواية ما سوى الموضوع من أنواع الحديث الضعيف من غير اهتمام ببيان ضعفه فيما سوى صفات الله تعالى وأحكام الشريعة من الحلال والحرام وغيرهما وذلك كالمواعظ والقصص وفضائل الأعمال وسائر فنون الترغيب والترهيب وسائر ما لا تعلّق له بالأحكام والعقائد، ومِمّن روينا عنه التنصيص على التساهل في نحو ذلك عبد الرحمان بن مهدیؒ وأحمد بن حنبلؒ". (۳)

علامہ ابن حجر نے "القول المسدد" میں فرمایا کہ:

" وقد ثبت عن الإمام أحمد وغيره من الائمة أنهم قالوا إذا روينا في الحلال والحرام شدّدنا وإذا روينا في الفضائل ونحوها تساهلنا". (۴)

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی یہی قول غالباً راجح ہے؛ کیونکہ انہوں نے اسی کا ذکر کیا ہے۔ علامہ حصکفیؒ نے "درمختار" میں فرمایا:

" شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدّة ضعفه وأن يدخل

(۱) الکفایہ: ۱۳۴ (۲) الکفایہ: ۱۳۴ (۳) مقدمہ ابن الصلاح: ۴۰ واللفظ لہ ارشاد الطلاب: ۱/۲۷۰

(۴) القول المسدد: ۱۱-۱۲

تحت أصل عام وأن لا يعتقد سنّيّة ذلك الحديث". (۱)

اس عبارت میں اگرچہ عمل بالضعیف کے شرائط کا بیان مقصود ہے، تاہم اس سے عمل بالضعیف کا جواز مفہوم ہوتا ہے۔

حدیثِ موضوع

حدیث موضوع کی تعریف

حدیث موضوع کی تعریف میں علماء حدیث نے لکھا ہے :"هو الحديث المُختلَق المصنوع وهو شرّ الأحاديث الضعيفة" (۲)

یعنی موضوع وہ حدیث ہے جو گھڑ کر بنائی گئی ہو اور یہ تمام احادیث ضعیفہ میں سب سے بدترین قسم ہے۔

وضع کے لغت میں متعدد معنی آتے ہیں:

(۱) اسقاط

(۲) ترک

(۳) افتراء وغیرہ

لہٰذا لغت میں موضوع کے معنی ساقط کیا ہوا (مسقط) یا متروک یا من گھڑت کے ہوتے ہیں۔ (۳)

لہٰذا حدیث موضوع درجۂ اعتبار سے ساقط اور قابل ترک ہوتی ہے۔ اور ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ وضع کے معنی الصاق یعنی ملنے کے بھی آتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے "وضع فلان على فلان كذا أي ألصق به." اس صورت

---

(۱) درمختار مع شامی: ۱/۱۲۸ (۳) ارشاد الطلاب: ۱/۲۵۸، مقدمہ ابن الصلاح: ۳۸، النکت علی ابن الصلاح: ۲/۶۱۴، الفیۃ العراقی: ۳۸ (۳) القاموس: ۳/۹۴

پر حدیث موضوع کو موضوع اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حضور علیہ السلام سے (باجود من گھڑت ہونے کے) ملائی گئی ہے۔ (۱)

بہر حال حدیث موضوع وہ ہے جو حقیقۃً رسول اللہ ﷺ کی حدیث نہ ہو اور جھوٹ کے طور پر آپ کی طرف منسوب کر دی گئی ہو۔

حدیث موضوع کی پہچان

اور حدیث موضوع کے معلوم کرنے اور پہچاننے کے لیے کیا طریقہ اور علامت ہے؟ اس بارے میں عموماً یہ لکھا گیا ہے کہ راوی کذاب کا سلسلہ رواۃ میں ہونا، روایت کے موضوع ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے بعض حضرات نے موضوع حدیث کی تعریف میں یہ لکھا ہے کہ اس کے راوی کے کذاب ہونے کی وجہ سے اس پر طعن کیا گیا ہو تو وہ موضوع ہے۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا:

"لأن الطعن إما أن يكون لكذب الراوي۔ وهو الموضوع" (۲)

مگر محدثین کے طرز و طریقے اور دوسرے بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی راوی کا کذاب ہونا حدیث کے موضوع ہونے کی کوئی قطعی دلیل یا علامت نہیں ہے؛ کیونکہ جھوٹا بھی کبھی سچ بول دیتا ہے، البتہ غالب ظن کے اعتبار سے اس کو موضوع قرار دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ:

"والحكم عليه بالوضع إنما هو بطريق الظن الغالب لا بالقطع إذ قد يصدق الكذوب". (۳)

اس لیے کسی اسناد میں کذاب کے ہونے سے یقیناً وضع کا حکم نہیں لگایا جا سکتا،

---

(۱) النکت علی ابن الصلاح: ۲/۶۱۴ (۲) نزہۃ النظر: ۵۹ (۳) نزہۃ النظر: ۵۹

البتہ دیگر قرائن بھی اس کے مؤید ہوں تو پھر وضع کا حکم ہوگا اور اگر قرائن وشواہد اس کی حدیث کی تائید کرتے ہوں، تو اس کو بے اصل اور موضوع نہیں کہا جائے گا۔اسی وجہ سے علماء حدیث نے لکھا ہے کہ:

''اگر حدیث کا ضعف کذب راوی کی وجہ سے ہو تو تعدد طرق کی وجہ سے وہ حدیث اگرچہ درجۂ حسن یا صحیح تک نہیں پہنچتی، لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے، بلکہ بعض وقت طرق کی کثرت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اس سند کی طرح ہو جاتی ہے جس میں معمولی ضعف ہو اور اگر اس کے ساتھ یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ حدیث ایک اور ایسی سند سے آئی ہے جس میں معمولی ضعف ہے تو وہ حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ جائے گی''۔

چنانچہ علامہ سخاوی ''فتح المغیث'' میں کہتے ہیں:

" ولكن بكثرة طرقه القاصرة عن درجة الاعتبار بحيث لا يجبر بعضها ببعض يرتقي عن رتبة المردود المنكر الذي لا يجوز العمل به بحال إلى رتبة الضعيف الذي يجوز العمل به في الفضائل،و ربما تكون تلك الطرق الواهية بمنزلة الطريق التي فيها ضعفٌ يسيرٌ بحيث لو فرض مجيء ذلك الحديث بإسناد فيه ضعفٌ يسيرٌ كان مرتقياً بها إلى رتبة الحسن لغيره". (۱)

اور علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"وأما الضعيف لفسق الراوی أو كذبه فلا يُؤثّرفيه موافقة غيره له إذا كان الآخرمثله لقوة الضعف وتقاعد الجابر، نعم يرتقي بمجوع

(۱) فتح المغیث: ۱/۴۳۷

طرقه عن كونه منكراً أولا أصل له ، صرح به شيخ الاسلام، بل قال: ربما كثرت الطرق حتى أوصلته إلى درجة المستور السيء الحفظ بحيث إذا وجد له طريق آخر فيه ضعف قريب محتمل ارتقى بمجموع ذلك إلى درجة الحسن ". (۱)

اور علامہ طاہر الجزائری فرماتے ہیں کہ:

"وقال بعض الحفاظ: إن هذا النوع قد تكثر فيه الطرق وإن كانت قاصرةً عن درجة الاعتبار حتى يرتقي عن رتبة المنكر الذي لا يجوز العمل به بحال إلى رتبة الضعيف الذي يجوز العمل به في الفضائل و ربما صارت تلك الطرق الواهية بمنزلة الطريق التي فيها ضعفٌ يسيرٌ بحيث لو فرض مجيء ذلك الحديث بإسناد فيه ضعفٌ يسيرٌ صار مرتقياً من رتبة الضعيف إلى رتبة الحسن لغيره." (۲)

اور اس کے برخلاف کذاب راوی کی حدیث کے خلاف قرائن موجود ہوں، تو اس پر وضع کا حکم قطعی طور پر لگایا جا سکتا ہے اور یہ قرائن مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

(۱) حدیث کا قرآن پاک کے مضمون کے خلاف ہونا۔

(۲) متواتر حدیث کے مضمون کے خلاف ہونا۔

(۳) تاریخی حقائق کے خلاف ہونا۔

(۴) الفاظ کا رکیک ہونا، جو اللہ کے رسول ﷺ کی شان سے بعید ہیں۔

(۵) بدیہیات عقل کے خلاف ہونا۔

(۶) ایسی بات پر مشتمل ہونا جس کا چرچا ہونا چاہئے تھا، مگر پھر بھی اس راوی کے سوا کوئی اور اس کو بیان نہ کرے۔

---

(۱) تدریب الراوی: ۱/۱۷۷ (۲) توجیہ النظر: ۱/۳۶۳

(۷)معمولی اور چھوٹے اعمال پر ثواب کثیر اور معمولی گناہ پر وعید شدید کا اس میں بیان ہونا وغیرہ۔(۱)

حضرات فقہاء نے بھی اس کو بیان کیا ہے اور اس کو انقطاع باطنی کا نام دیا ہے اور اس کی چار صورتیں بیان کی ہیں۔امام غزالی اپنی کتاب ''المستصفیٰ من علم الاصول'' میں فرماتے ہیں:

''القسم الثاني من الأخبار مايُعْلَمُ كذبه وهى أربعة:

الأول مايُعْلَمُ خلافُه بضرورة العقل أوالنظر أوالحس أوالمشاهدة أوأخبارالتواتر، وبالجملة ماخالف المعلومَ بالمدارك الستّة المذكورة۔

الثاني: مايُخَالِفُ النَّص القاطعَ من الكتاب والسنة المتواترة وإجماع الأمة.

الثالث: ماصرح بتكذ يبه جمعٌ كثيرٌعن نقله والتحديث به مع جريان الواقعة بمشهد منهم ومع إحالة العادة السكوت عن ذكره لتَوَفُّرالدواعي على نقله .''(۲)

امام بزدوی اور علامہ ملاجیون نے لکھا کہ:

انقطاع باطنی کی دوصورتیں ہیں:ایک یہ کہ انقطاع بالمعارضہ ہو،اور دوسرے یہ کہ انقطاع راوی میں قصور ونقصان کی وجہ سے ہو۔ پھر اول کی چار صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) کتاب اللہ کے خلاف ہو۔

(۲)سنت معروفہ کے خلاف ہو۔

---

(۱)اس کی تفصیل مع امثلہ کے لیے دیکھئے ''السنّة ومكانتها في التشريع الاسلامي :۹۸-۱۰۲ (۲)المستصفی:۱/۹۱مختصراً

(۳) مشہور واقعہ جس کا چرچا ہونا چاہئے، اس کو ایک ہی آدمی بیان کرے۔

(۴) صحابہ کرام اس کے ذکر سے اعراض کریں۔ (۱)

غرض یہ کہ اگر کذاب راوی کی حدیث، مذکورہ امور پر مشتمل ہو تو پھر اس کے موضوع ہونے کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

حدیث موضوع کا حکم

تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حدیث موضوع کو بیان کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ اس کے موضوع ہونے کا بیان بھی ساتھ ساتھ کر دیا جائے اور حدیث موضوع کسی بھی سلسلے میں قابل عمل نہیں۔ امام نوویؒ اور اسی طرح تمام علماء نقل فرماتے ہیں:

"ولاتحِلُّ روايتُه لأحد عَلِمَ حالَه في أي معنى كان إلا مقروناً ببيان وضعه." (۲)

اور علامہ ابن تیمیہؒ نے امام احمدؒ و دیگر محدثین کا طریقہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"إنهم إذا عرفوا أن الحديث كذب فإنهم لم يكونوا يستحلّون روايتَها إلا أن يُبيِّنُوا أنه كذبٌ لقول النبي ﷺ في الحديث الصحيح: "مَنْ رَوٰى عَنِّيْ حَدِيْثًا يَرٰى أَنَّـهٗ كِذْبٌ فَهُوَ أَحَدُ الكَاذِبِيْنَ". (۳)

غرض یہ کہ حدیث کا موضوع ہونا معلوم ہو جائے اور ادلہ اس پر قائم ہوں، تو پھر کسی طرح بھی اس کی روایت جائز نہیں الا یہ کہ اسکا موضوع ہونا ساتھ ساتھ بیان

---

(۱) اصول بزدوی: ۱۷۳، نور الانوار: ۱۸۹-۱۹۰ (۲) ارشاد الطلاب: ۱/۲۵۸، مقدمہ ابن الصلاح: ۳۸، نزہۃ النظر: ۶۲، تدریب: ۱/۲۷۴ (۳) مجموعۃ الفتاوی: ۱۰/۴۰۹

کر دیا جائے، اور اس پر عمل کرنا بھی کسی طرح جائز نہیں۔

حدیث ضعیف متلقی بالقبول

حدیث ضعیف جس کی تعریف و تقسیم اور اسکا اجمالی حکم اوپر بیان ہو چکا، بعض اوقات تلقی بالقبول کی وجہ سے وہ مقبول کی اقسام میں داخل ہو جاتی ہے، علماء حدیث نے متعدد جگہ یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔

اس سلسلہ میں چند نقول پیش کرتا ہوں:

علامہ عبد البر مالکیؒ نے حدیث " هو الطهور ماؤه" کے بارے میں امام ترمذی سے اولاً یہ نقل کیا کہ امام بخاری نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، پھر فرمایا کہ محدثین اس جیسی سند کی تصحیح نہیں کرتے، لیکن میرے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، کیونکہ علماء نے اس کو قبول کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"وأهل الحديث لا يُصَحِّحُون مثل إسناده ولكن الحديث عندي صحيحٌ لأن العلماء تلقّوه بالقبول" (۱)

علامہ ابن القیمؒ حدیث معاذ بن جبل (بسلسلہ قیاس واجتہاد) پر بحث کرتے ہوئے اور بھی متعدد احادیث نقل کر کے فرماتے ہیں کہ ابوبکر خطیب نے فرمایا کہ:

"وإن كانت هذه الأحاديث لا تثبت من جهة الإسناد ولكن لمّا تلقّتها الكافّة عن الكافة غنوا بصحتها عندهم عن طلب الإسناد لها فكذلك حديث معاذ لمّا احتجوا به جميعاً غنوا عن طلب الإسناد له." (۲)

علامہ ابن العربیؒ نے ''عارضۃ الاحوذی شرح سنن الترمذی'' میں حدیث "هو الطهور ماؤه" کے بارے میں فرمایا کہ:

(۱) الاستذکار: ۱/۲۰۱ (۲) اعلام الموقعین: ۱/۲۰۲

”وهو حديث مشهور ولكن في طريقه مجهول وهو الذي قطع بالصحيحين عن إخراجه ، وأصل مالك شهرة الحديث بالمدينة تُغني عن صحة سنده وإن لم يتابَع عليه “. (۱)

ان تمام نقول سے واضح ہوا کہ حدیث اگر چہ ضعیف ہو،لیکن تلقی بالقبول والتصدیق ہوتو وہ مقبول ہوجاتی ہے۔

تلقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟

تلقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟اس سے مراد یہ ہے کہ بلانکیر اہل علم حضرات اس کو روایت کریں اور اس کے مفاد و مضمون پر عمل کریں ،اس طرح تلقی کی دو صورتیں ہوجائیں گی:ایک تلقی قولی،دوسری تلقی عملی۔

علامہ ابن تیمیہؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

”فالخبر الذى تلقّاه الائمة بالقبول تصديقاً له أوعملاً بموجَبه يُفيدُ العلمَ عند جماهير السلف والخلف“. (۲)

اس عبارت میں تصدیق سے مراد،روایت بلانکیر کرنا اور عمل بموجبہ سے،اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔

مولانا ظفراحمد عثمانیؒ نے فرمایا کہ

”قلت:والقبول يكون تارةً بالقول وتارةً بالعمل عليه“. (۳)

اب رہا یہ سوال کہ کن لوگوں کی تلقی معتبر ہوگی؟ تو اسکا جواب واضح اور ظاہر ہے کہ مراد اہل علم حضرات کی تلقی ہے کہ محدثین اور فقہاء امت اسکو نقل کریں اور اس پر عمل کریں۔

عارضۃ الاحوذی:۱/۷/۸ (۲) مجموعۃ الفتاوی:۱۸/۴۸ (۳) مقدمہ اعلاء السنن:۱/۴۰

امام ترمذیؒ کے طریقے وطرز سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے؛ کیونکہ انہوں نے جگہ جگہ فرمایا کہ: " والعمل علیه عنداهل العلم "

علامہ ابن الھمامؒ نے "فتح القدیر" میں امام ترمذی کے اس جملہ کے بارے میں فرمایا کہ: یہ جملہ تقاضا کرتا ہے کہ اس حدیث کی اصل قوی ہے، اگر چہ خاص یہ سند ضعیف ہے۔ (۱)

بہرحال جب محدثین وفقہاء روایت کریں اور اس پر عمل کریں تو وہ حدیث متلقی بالقبول کہلائے گی۔

حدیث متلقی بالقبول کا درجہ اور حکم

حدیث متلقی بالقبول درجہ کے لحاظ سے احادیث صحیحہ میں شمار ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات اس کا درجہ اخبار احاد سے گذر کر احادیث مشہورہ یا متواترہ کے برابر ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

" وأما ما اتفق العلماء على صحته فهومثل ما اتفق عليه العلماء في الأحكام وهذا لا يكون إلا صدقاً ". (۲)

یعنی علماء جس حدیث کی صحت پر اتفاق کرلیں وہ اس کے مثل ہے جیسے علماء احکام میں کسی پر اتفاق کرلیں اور یہ بات سچ ہی ہوتی ہے (کیونکہ اجماع میں خطاء نہیں ہوسکتی)۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"فالخبر الذي تلقّاه الائمة بالقبول تصديقاً له أوعملاً بموجبه يفيد العلم عند جماهير السلف والخلف وهذا في معنى المتواتر لكن من

(۱) فتح القدیر: ۱/۲۱۷ (۲) مجموعۃ الفتاوی: ۱۸/۲۲

الناس من يُسَمّيه المشهور والمستفيض ''(۱)

علامہ ابوبکر الجصاص الرازی نے حدیث "طلاق الأمة اثنتان" (باندی کی طلاق دو ہیں) اور اس کے ہم معنے ایک اور حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"وقد استعملت الأمة هذين الحديثين في نقصان العدّة و إن كان وروده من طريق الآحاد فصار في حيز المتواتر لأن ما تلقّاه الناس بالقبول من أخبار الآحاد فهو عندنا في معنى المتواتر". (۲)

اور علامہ ابن الصلاح نے ''مقدمہ'' میں فرمایا کہ:

"وأمهات أقسام وأعلاها الأول هوالذي يقول فيه أهل الحديث كثيراً صحيحٌ متفقٌ عليه يُطلِقُون ذلك ويعنون اتفاق البخارى ومسلم لا اتفاق الائمة ، لكن اتفاق الأمة عليه لازم من ذلك وحاصل معه لا تفاق الأمة على تلقي ما اتفقاعليه بالقبول، هذا القسم جميعه مقطوع بصحته والعلم اليقيني النظرى واقع به". (۳)

علامہ زرکشی نے اپنی ''النكت على ابن الصلاح'' میں امام ابوبکر بن فورک کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ جس حدیث کو امت قبول کرلے وہ قطعی طور پر سچ ہوتی ہے، نیز قاضی عبدالوھاب سے نقل کیا ہے کہ امت جب کسی حدیث کو قبول کرلے اور اس کی تصدیق کردے تو یہ بات اس کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ امت کے اجماع میں خطاء نہ ہونے پر دلیل قائم ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں نقل کیا گیا ہے۔

ان تمام عبارات سے واضح ہوگیا کہ:

(۱) حدیث متلقی بالقبول صحیح کے اعلی درجات میں داخل ہے بلکہ متواتر یا

---

(۱) مجموعۃ الفتاوی: ۴۸/۱۸ (۲) احکام القرآن: ۳۸۶/۱ (۳) مقدمہ ابن الصلاح: ۱۲

مشہور حدیث کے برابر ہے۔

(۲) جس طرح اجماعی حکم قطعی ہوتا ہے، اسی طرح حدیث متلقی بالقبول کی صحت بھی قطعی ویقینی ہوتی ہے۔

(۳) البتہ اس سے جو یقینی علم حاصل ہوتا ہے، وہ نظری ہوتا ہے، متواتر کی طرح ضروری وبدیہی نہیں۔(وهذا العلم اليقيني الحاصل من تلقي الأمة بالقبول علم نظري لا ضروري ، أي لا يحصل إلا لمن تبحّر في علوم الحديث وعرف بأحوال الرواة وهذا معنى قولهم "علم نظري")

اس کے بعد اس پر غور کرنا ہے کہ حدیث متلقی بالقبول کا حکم کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب حدیث متلقی بالقبول کا صحیح ہونا اور اس سے علم یقینی کا حاصل ہونا معلوم ہوگیا تو اس کا حکم بھی واضح ہوگیا کہ اس پر عمل واجب ہے، اس لئے کہ جب اخبار آحاد کی صحت ثابت ہو جائے، اگرچہ ظنی طور پر ہی کیوں نہ ہو تو ان پر عمل جمہور کے نزدیک واجب ہے اور حدیث متلقی بالقبول تو یقینی طور پر صحیح ہے، لہٰذا اس پر عمل بھی واجب وضروری ہے۔

علامہ زرکشی اور علامہ سخاوی نے فرمایا کہ:

" إذا تلقّت الأمة الضعيفَ بالقبول يُعْمَلُ بِهِ على الصحيح حتى أنه ينزل منزلة المتواتر ". (۱)

تلقی کی دوصورتوں میں فرق

البتہ یہاں یہ سوال متوجہ ہوسکتا ہے کہ اوپر تلقی کی جو دوصورتیں پیش کی گئی ہیں یعنی قولی تلقی اور عملی تلقی، ان میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۱) فتح المغیث: ۱/۲۸۹

اس سلسلے میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا؛ کیونکہ حضرات علماء حدیث نے بلا کسی فرق کے تلقی بالقبول کا ذکر کیا ہے، اگر ان میں کوئی فرق ہوتا تو ضرور نقل کیا جاتا، لہٰذا تلقی خواہ قولاً ہو خواہ عملاً ہو، ہر دو صورت پر وہ حدیث واجب العمل ہوگی جسے تلقی حاصل ہو، البتہ ابن فورک نے یہ بیان کیا ہے کہ:

''اگر صرف عملاً تلقی بالقبول پائی جائے تو حدیث کی صحت قطعی نہ ہوگی اور اگر قولاً وعملاً دونوں طرح تلقی پائی جائے تو اسکی صحت قطعی ہوگی''۔

حافظ ابن حجر نے اپنی ''النکت'' میں ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"قال ان اتفقوا على العمل به لم يقطع بصدقه وحمل الأمر على اعتقادهم وجوب العمل بخبر الواحد وإن تلقّوه بالقبول قولاً وفعلاً حكم بصدقه قطعاً". (۱)

مگر یہ فرق صرف صحت کے قطعی وظنی ہونے کے لحاظ سے کیا گیا ہے، عمل کے واجب ہونے کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ (كما قلنا)

حدیث ضعیف مؤید بالقرائن

حدیث ضعیف کبھی مؤید بالقرائن ہوتی اور اسکی وجہ سے اسکا ضعف منجبر ہو جاتا ہے اور اسی قسم کی حدیث اہل فن کے اصطلاح میں ''حسن لغیرہ'' کہلاتی ہے، چنانچہ ''حسن لغیرہ'' کی تعریف ابن حجر نے یہ کی ہے:

" وهو الذي يَكُونُ حُسْنُه بسبب الاعتضاد نحو حديث المستور إذا تعدّدتْ طرقُه". (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مستور کی حدیث جو کہ ضعیف ومردود ہوتی ہے، جب

(۱) النکت: ۱/۱۶۶، نیز دیکھو النکت للزرکشی: ۱/۲۸۱ (۲) نزہۃ النظر: ۳۴

تعدد طرق سے مؤید ہو جائے تو حسن لغیرہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

”وإن قامت قرينةٌ تُرَجِّحُ جانبَ قبول ما يُتَوَقَّفُ فيه فهو الحسَنُ لكن لا لذاته“. (۱)

بہر حال یہ معلوم ہوا کہ اگر قرائن پائے جائیں تو ضعیف حدیث بھی حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی کو حدیث منجبر الضعف کہا جاتا ہے۔

اور ایسی حدیث مقبول ہوتی ہے، چنانچہ ”تدریب الراوی“ میں ہے کہ:

”ولا بدع في الاحتجاج بحديث له طريقان لَوِ انْفَرَدَ كُلٌّ منهما لم يكن حجةً كما في المرسل إذا ورد من وجه آخر مُسْنَداً أو وافقه مرسل بشرطه“. (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ ضعیف روایت اگر دو طریقوں سے وارد ہو تو اس سے احتجاج کرنا درست ہے اور ظاہر ہے کہ احتجاج قبول کی فرع ہے، لہٰذا ایسی روایت مقبول ہوگی۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

” ومتى تُوُبِعَ السِيِّئُ الحفظ بمُعتبَر كأن يكون فوقه أو مثله لا دونه ، وكذا المختلط الذي لا يتميز والمستور والاسناد المرسل وكذا المدلس إذا لم يعرف المحذوف منه صار حديثهم حسناً لا لذاته ، بل وصفه بذالك باعتبار المجموع من المتابع والمتابَع لأن كل واحد منهم باحتمال كون روايته صواباً أو غير صواب على حدٍّ سَوَاء ، فإذا جاء ت من المعتبرين رواية لأحدهم رجح أحد الجانبين من الاحتماليين المذكورين ودلّ ذلك على أن الحديث محفوظ فارتقى من درجة

(۱) نزھۃ النظر: ۲۵ (۲) تدریب: ۱/۱۶۰

التوقّف إلى درجة القبول ومع ارتقائه إلى درجة القبول فهو منحطّ عن درجة الحسن لذاته". (۱)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ سوء حافظہ اور اختلاط کا شکار جس کی روایات میں یہ تمیز نہ کی جا سکے کہ اختلاط سے قبل کی ہیں یا بعد کی، اس کی متابعت کی جائے، اسی طرح مستور الحال اور مرسِل و مدلِس راوی کی متابعت کی جائے یعنی دوسرے طریق سے وہ روایت آجائے تو ان کی حدیث حسن لغیرہ قرار پاتی ہے اور ان کی حدیث پر یہ حکم باعتبار مجموعہ کے ہوگا؛ کیونکہ جس ضعیف کی متابعت کی گئی وہ اور جس نے متابعت کی وہ دونوں، صحیح ہونے یا غلط ہونے کے احتمال میں برابر ہیں۔ جب دوسری طرف سے اس کی موافقت ہوگئی تو دو احتمالوں میں سے ایک راجح ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ حدیث محفوظ ہے، لہٰذا یہ درجۂ توقف سے درجۂ قبول کی طرف ترقی کر جائے گی لیکن حسن لذاتہ نہ ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث منجبر الضعف مقبول ہوتی ہے اور اس سے احتجاج درست و صحیح ہے۔

حدیث منجبر الضعف کس جگہ معتبر ہے؟

مگر سوال یہ ہے کہ حدیث منجبر الضعف و مؤید بالقرائن، ہر باب میں مقبول و معتبر ہے یا کسی خاص باب میں اس کا اعتبار ہوگا؟

اس کا جواب ابن القطانؒ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے جس کو ابن حجرؒ نے اپنی کتاب ''النکت علی ابن الصلاح'' میں نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

" إن هذا القسم لا يُحْتَجُّ به كُلِّهِ بل يُعْمَلُ بِهِ في فضائل الأعمال

---

(۱) نزہۃ النظر: ۷۹

ویُتَوَقَّفُ عن العمل به في الأحكام إلا إذا كَثُرَت أو عضده اتصال عمل أو شاهد صحيح أو ظاهر القرآن ". (۱)

اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ:

(۱) حدیث حسن لغیرہ ہر باب میں علی الاطلاق معتبر ومقبول نہیں ہے۔

(۲) بلکہ فضائل اعمال میں معتبر ومقبول ہے۔

(۳) ہاں اگر مزید قرائن کی وجہ سے اس کو مزید قوت حاصل ہو جائے تو پھر احکام میں بھی اس کا اعتبار ہے۔

(۴) اور مزید قرائن جو اس کو قوت پہنچاتے ہیں، وہ مثلاً یہ ہیں:

(۱) کثرت طرق (۲) اس پر عمل کا توارث کے طور پر جاری رہنا (۳) اس مضمون ومعنی کی دوسری حدیث صحیح کا پایا جانا (۴) ظاہر قرآن سے موافقت ہونا وغیرہ۔

الحاصل حسن لغیرہ وحدیث ضعیف منجبر، فضائل کے باب میں تو ہر صورت میں معتبر ہے اور احکام میں اس شرط سے معتبر ہے کہ کثرت طرق وغیرہ قرائن سے اس کو مزید تقویت حاصل ہو جائے۔ (واللہ اعلم) ہاں اگر کوئی اور حدیث باب میں نہ ہو تو امام احمدؒ وابوحنیفہؒ کے نزدیک احکام میں بھی اس کا اعتبار ہوگا۔ (کما سیاتی)

انجبارِ ضعف کے اسباب وقرائن

حدیث میں موجود ضعف کا انجبار متعدد اسباب وقرائن سے ہوسکتا ہے، مگر ان میں سے سب سے اہم سبب وقرینہ تعدد طرق ہے کہ وہ حدیث دیگر سندوں اور طریقوں سے ثابت ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:

---

(۱) النکت: ۱/۲۹۶

”وهذه الأحاديث عامّتُها إذا جرد إسناد الواحد منها لم يَخُلُ عن مقال قريب أوشديد لكن تعدّدها و كثرة طرقها يغلب على الظن ثبوتها في نفس الأمر بل قد يقتضي القطع بها“.(۱)

مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے فرمایا:

”والحديث الضعيف اذا تعددّت طرقُه ولو طريقاً واحدةً أخرى ارتقى بمجموع ذلك إلى درجة الحسن و كان محتجاً له“.(۲)

غرض یہ کہ تعدد طرق ایک اہم سبب ہے جس سے حدیث ضعیف کا ضعف ختم ہوجاتا اور وہ حدیث حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔

پھر یہاں محدثین کی دو اصطلاحات ہیں، جن سے تعدد طرق کی کیفیت ونوعیت کا اندازہ ہوتا ہے، ایک متابعت، دوسرے شاہد۔ اگر متابعت پائی جائے یا شاہد پایا جائے تو روایت کو تقویت ملتی ہے۔

متابعت

متابعت یہ ہے کہ ایک راوی کی دوسرا راوی روایت میں موافقت کرے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں: متابعت تامہ و متابعت قاصرہ۔ متابعت تامہ یہ ہے کہ خود اس راوی کی موافقت کی جائے اور قاصرہ یہ ہے کہ اس راوی کے شیخ یا شیخ کے اوپر کے راویوں کی موافقت کی جائے۔

علامہ ابن حجر نے کہا کہ: ” والمتابعة على مراتب إن حصلت للراوی نفسه فهي التامّة وإن حصلت لشيخه فمن فوقَه فهي القاصرة.“(۳)

متابعت تامہ وقاصرہ کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ حماد نے ایوب سے اور

(۱) فتاوی ابن تیمیہؒ: ۴۰۳/۶ (۱) مقدمہ اعلاء السنن: ۴۹/۱ (۳) نزہۃ النظر: ۴۴

ایوب نے ابن سیرین سے اور انہوں نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا، پس اگر ایوب سے حماد کے علاوہ کوئی اور بھی روایت کرے تو یہ حماد کی متابعت تامہ ہوئی اور اگر ایوب سے حماد کے علاوہ کوئی راوی نہ ہو، لیکن ابن سیرین سے ایوب کے سوا دوسرا راوی روایت کرے تو یہ حماد کی متابعت قاصرہ ہے۔ اسی طرح ابو ہریرہؓ سے حماد کی روایت کردہ اس حدیث کو ابن سیرین کے علاوہ کوئی اور روایت کرے، تب بھی یہ متابعت قاصرہ ہے۔ (۱)

متابعت میں دونوں راویوں کے الفاظ ایک ہونا ضروری نہیں، بلکہ معنی میں موافقت ہو تو کافی ہے، لیکن دونوں روایات ایک ہی صحابی سے ہونا شرط ہے۔ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ:

"ولا اقتصار في هذه المتابعة سواء كانت تا مةً او قاصرةً على اللفظ بل لو جاء ت بالمعنى لكفى لكنها مختصةٌ بكونها من رواية ذلك الصحابي". (۲)

یہ جمہور کا مسلک ہے اور بعض نے کہا ہے کہ متابعت کے لئے ضروری ہے کہ لفظ میں اتحاد ہو، خواہ صحابی وہی ہوں یا دوسرے، مگر عملی اعتبار سے محدثین کے یہاں پہلا مسلک ہی رائج ہے۔

شاہد

شاہد یہ ہے کہ دوسرے صحابی سے اس حدیث کا متن پایا جائے، خواہ لفظ و معنی دونوں موافق و مشابہ ہوں یا صرف معنے موافق ہوں۔ (۳)

---

(۱) ارشاد الطلاب: ۱/۲۲۲ (۲) نزہۃ النظر: ۴۵ (۳) نزہۃ النظر: ۴۵، ارشاد الطلاب: ۱/۲۲۳

پہلی صورت یعنی لفظ و معنی دونوں میں موافقت کی مثال وہ حدیث ہے جس کو امام نسائی نے محمد بن جبیر عن ابن عباس عن النبی ﷺ روایت کیا کہ مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے، پس روزہ نہ رکھو جب تک کہ چاند نہ دیکھو اور نہ افطار کرو جب تک کہ چاند نہ دیکھو، اگر چاند تم پر مستور ہو جائے تو تیس دن مکمل کرلو۔

یہ حدیث شاہد ہے اس حدیث کی جس کو امام شافعی نے مالک سے عن عبد اللہ بن دینار عن ابن عمر عن النبی ﷺ روایت کیا ہے اور اسی جیسے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

اور صرف معنی میں مشابہ ہونے کی مثال وہ ہے جس کو بخاری نے محمد بن زیاد سے عن ابی ہریرہؓ روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

"فإن غُمّ عليكم فأكملوا عدّة شعبان ثلثين". (۱)

غرض یہ کہ جب کسی روایت کی متابعت کی جائے یا اس کا شاہد پایا جائے تو یہ تعدد طرق، روایت کے ضعف کو دور کردیگا۔

تعدد طرق کے علاوہ انجبار ضعف کے اسباب وقرائن اور بھی ہیں جن کو یہاں مختصراً بیان کیا جاتا ہے:

(۱) صحابی کے قول کا کسی حدیث کے موافق ہونا، یہ بھی ایک اہم سبب وقرینہ ہے جس سے روایت کو قوت ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ جو کہ مرسل حدیث کو ناقابل احتجاج قرار دیتے ہیں، انہوں نے مرسل حدیث کو اس وقت قبول کیا ہے جبکہ اس کی تائید بعض صحابہ کے قول سے ہو جائے۔ (۲)

(۲) صحابہ کے عمل کا کسی حدیث کے موافق ہونا، امام شافعیؒ نے اس مرسل کو بھی قبول کیا ہے جس کے موافق صحابہ میں سے بعض کا عمل ہو۔ (۳)

---

(۱) نزہۃ النظر: ۴۵ (۲) ارشاد الطلاب: ۱/۱۷۶ (۳) مقدمہ شرح مسلم للنووی: ۱۷

(۴) اہل علم کے قول وعمل کا کسی حدیث کے موافق ہونا، اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے اس مرسل کو بھی معتبر وحجت مانا ہے جس کے موافق علماء کا فتوی وعمل ہو۔(۱)

غرض یہ کہ تعدد طرق سب سے اہم قرینہ ہے جو جابر ضعف ہے، پھر یہ دوسرے قرائن بھی ہیں جن سے ضعف کا انجبار ہوسکتا ہے۔

تعدد طرق سے کیا مراد ہے؟

تعدد طرق کا ذکر تفصیلاً ہو چکا، اس سلسلے میں چند ضمنی مسائل ہیں جن کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے، ان میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ تعدد طرق سے کیا مراد ہے کیا کسی حدیث کا ایک سے زائد طریق سے مروی ہونا کافی ہے یا اس سے زائد طرق ہونا چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تعدد طرق سے مراد ایک سے زائد طریق سے مروی ہونا ہے، دو، تین طرق کا ہونا ضروری نہیں۔ علامہ سیوطی نے ''تدریب الراوی'' میں لکھا ہے کہ:

"لابدع في الاحتجاج بحديث له طريقان لو انفرد كل منهما لم يكن حجةً" (۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی حدیث کی صرف دوسندیں ہوں، اگرچہ دونوں ضعیف اور نا قابل احتجاج ہوں، تو ان سے بھی حتجاج درست ہے، معلوم ہوا کہ تعدد کے لیے ایک سے زائد سند کا ہونا کافی ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"والحديث الضعيف إذا تعددت طرقه ولوطريقاً واحدةً أخرى ارتقى بمجموع ذالك إلى درجة الحسن و كان محتجّاً به" (۳)

---

(۱) مقدمہ شرح مسلم للنووی: ۱۷، ارشاد الطلاب: ۱/۱۷۶ (۲) تدریب الراوی: ۱/۱۶۰ (۳) مقدمہ اعلاء السنن: ۱/۴۹

دوسری سند بھی ضعیف ہوتو

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حدیث ضعیف کا دوسرا طریق بھی ضعیف ہوتو کیا یہ بھی جابر ضعف ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری سند بھی اگر چہ ضعیف ہو، تاہم انجبار ضعف اس سے بھی ہو جاتا ہے۔ اور علامہ سیوطی سے ''تدریب'' کی جو عبارت ابھی اوپر گذری وہ اس پر شاہد ہے؛ کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی حدیث کی دو سندیں ہوں اور وہ دو سندیں ایسی ہوں کہ ان میں ہر ایک بانفرادہ نا قابل احتجاج ہو، تب بھی ایسی حدیث سے احتجاج درست ہے۔ معلوم ہوا کہ دوسری حدیث اگر چہ ضعیف ہو، وہ بھی جابر ضعف ہوسکتی ہے۔

لیکن علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ دوسری سند کا راوی پہلی سند کے راوی سے کم درجہ کا نہ ہو، بلکہ یا تو اس سے فوقیت رکھتا ہو یا کم از کم اسی کے برابر ہو۔ چنانچہ ابن حجرؒ نے متابعت کی بحث میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

" ومتى توبع السئ الحفظ بمعتبر كأن يكون فوقه أومثله لا دو نه ". (۱)

مگر یہ شرط اس وقت ہونی چاہئے جب کہ زائد صرف ایک طریق ہو اور اگر کثرت طرق سے مؤید ہوتو پھر اس شرط کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ (واللہ اعلم)

تعدد طرق میں کیا ایک ہی صحابی کی روایت ہونا شرط ہے

اس سلسلے میں تیسرا سوال یہ ہے کہ تعدد طرق میں کیا یہ ضروری ہے کہ ایک ہی صحابی کی روایت ہو؟

---

(۱) نزہۃ النظر: ۷۹

اس کا جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں، بلکہ ایک ہی مضمون کئی صحابہ سے آیا ہوتو وہ بھی کافی ہے۔البتہ اصطلاحی طور پر متابعت وشہادت میں فرق کیا گیا کہ متابعت میں دونوں روایات ایک صحابی سے ہونا چاہئے اور شہادت میں یہ ضروری نہیں۔تاہم تعدد ہر دوصورت سے حاصل ہو جائے گا،لہٰذا تعدد کے پائے جانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ صحابی ایک ہو۔

دوسری روایت میں لفظ ومعنے دونوں کی موافقت شرط ہے؟

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ دوسری روایت جو جابر ضعف ہے،اس میں کیا یہ شرط ہے کہ لفظ و معنی دونوں میں پہلی حدیث کے موافق ہو یا صرف معنی میں موافقت کافی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف معنی ومضمون کا موافق ہونا کافی ہے،لفظ میں موافقت ضروری نہیں۔(۱)

کون سی حدیث جابر ضعف ہوسکتی ہے؟

ایک اہم مسئلہ اس ضمن میں یہ ہے کہ تعدد طرق وغیرہ قرائن سے،کیا ہر قسم کی ضعیف حدیث کو فائدہ پہنچتا اور تقویت حاصل ہوتی ہے یا یہ کہ اس میں کچھ تفصیل ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ ہر قسم کی ضعیف حدیث کو تعدد طرق سے یا اور قرائن سے تقویت نہیں ملتی بلکہ اس میں ایک اصول وضابطہ ہے،جس کو ابن حجر نے پیش کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

”والتحرير فيه أن يقال: إنه يرجع إلى الاحتمال في طرفي القبول والرد، فحيث يستوي الاحتمال فيهما فهو الذي يصلح لأن ينجبر

(۱) کما صرح بہ ابن حجر وقد نقلت عبارتہ فی ما قبل،راجع نزھۃ النظر:۴۵

وحيث يقوي جانب الرد فهو الذي لا ينجبر". (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی وجہ سے قوی نہیں ہو جاتی، بلکہ صرف وہ حدیث ضعیف تقویت پاتی ہے جس میں قبول ورد کی دونوں جانب برابر ہوں اور رد کی جانب قوی نہ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث میں ضعف اگر سوء حافظہ کی وجہ سے یا ارسال کی وجہ سے یا اس جیسی اور کسی وجہ سے ہو، تو وہ دوسرے طرق کی وجہ سے منجبر ہو جاتا ہے اور اگر مثلاً ضعف کی وجہ کذب راوی ہو یا تہمت کذب ہو یا فسق وبدعت ہو تو وہ تعدد طرق سے منجبر نہیں ہوتا۔

علامہ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

"إنه ليس كل ضعف في الحديث يزول بمجيئه من وجوه بل ذالك يتفاوت ، فمنه ضعف يزيله ذلك بأن يكون ضعفه ناشئاً من ضعف حفظ راويه مع كونه من أهل الصدق والديانة ، فإذا رأينا ماروراه قد جاء من وجه آخر عرفنا أنه ممّا قدحفظه ولم يختلّ فيه ضبط له ، وكذلك إذاكان ضعفه من حيث الإرسال زال بنحو ذلك ــــــــ ومن ذلك ضعف لا يزول بنحو ذلك لقوة الضعف وتقاعد هذا الجابر عن جبره ومقاومته، وذلك كالضعف الذي ينشأ من كون الراوى متّهماً بالكذب أو كون الحديث شاذاً". (۲)

اور علامہ نووی فرماتے ہیں:

"والجواب أنه ليس كل ضعيف يزول بمجيء الحديث من

---

(۲) النکت علی ابن الصلاح: ۲۰۶/۱ (۲) مقدمہ ابن الصلاح: ۱۴

وجوه بل ما كان ضعفه لضعف حفظ راويه الصدوق الأمين زال بمجيئه من وجه آخر لدلالة ذلك على عدم اختلال ضبطه ، و كذلك إذا كان الضعف لكونه مرسلاً زال بمجيئه من وجه آخر إما مسندًا أو مرسلاً ، أما إذا كان الضعف لكون الراوى متهماً بالكذب أو فاسقاً فلا ينجبر ذلك بمجيئه من وجه آخر ". (۱)

ان عبارات سے واضح ہوگیا کہ ضعیف کی صرف وہ قسم، تعدد طرق کی وجہ سے ضعف سے نکل جاتی ہے جس میں رد وقبول کی دونوں جانبوں کا احتمال برابر ہواور اگر وہ یکسر مردود ہو جیسے کذب راوی یا فسق راوی کی وجہ سے آیا ہوا ضعف، تو وہ کسی طرح منجبر نہیں ہوسکتا۔

ہاں تعدد طرق سے اتنا فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ منکر اور بے اصل ہونے سے نکل جاتی ہے۔ کما قال فی التدریب:

"وأما الضعف لفسق الراوى أو كذبه فلا يؤثّر فيه موافقة غيره إذا كان الآخر مثله لقوة الضعف وتقاعد هذا الجابر، نعم يرتقي بمجموع طرقه عن كونه منكراً أولا أصل له ". (۲)

احکام میں حدیث ضعیف سے استدلال

حدیث ضعیف احکام میں

ضعیف حدیث سے احتجاج اور اس پر عمل کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں تین اقوال مشہور ہیں جن کو ہم نے اوپر" حدیث ضعیف

(۲) ارشاد الطلاب: ۱/۱۴۸ (۲) تدریب الراوی: ۱/۱۷۷

کے اجمالی حکم'' کے تحت بیان کر دیا ہے اور جہاں تک احکام کے بارے میں ضعیف سے احتجاج و استدلال کا مسئلہ ہے تو اس میں محدثین نے عام طور پر یہی بیان کیا ہے کہ یہ درست اور جائز نہیں، لیکن فقہاء و محدثین کے طرز عمل سے اور بعض اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض صورتوں میں ضعیف حدیث سے بھی استدلال کو جائز رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض محدثین کے طرز عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن القیم نے سبھی ائمہ کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ:

اگر باب میں کوئی اور حدیث ثابت نہ ہو تو ضعیف حدیث اور مرسل حدیث ہی قابل احتجاج و اعتبار ہے اور اس صورت میں سبھی ائمہ کرام قیاس پر حدیث ضعیف کو مقدم رکھتے ہیں۔

ابن القیم نے امام احمد کا یہ مذہب نقل کر کے فرمایا کہ:

"ولیس أحد من الائمة إلا وهو موافقه على هذا الأصل من حيث الجملة، فإنه ما منهم أحد إلا وقد قدم الحديث الضعيف على القياس ''. (۱)

علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ :"قال أبو حنيفة:الخبر الضعيف عن رسول الله ﷺ أولى من القياس". (۲)

امام ابوحنیفہ کے بارے میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ:

"وأصحاب أبي حنيفة مجمعون على أن مذهب أبي حنيفة أن ضعيف الحديث عنده أولى من القياس والرأي". (۳)

نیز امام ابوداود کا طرز بھی یہی بتاتا ہے کہ وہ ضعیف حدیث کو اس وقت قبول کرتے ہیں جب اس باب میں کوئی اور حدیث نہ ہو۔ اسی طرح امام نسائی کا بھی

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۳۱ و ۷۷ (۲) مقدمہ اوجز المسالک: ۲۶ (۳) مقدمہ اوجز المسالک: ۶۷

طریقہ ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

چنانچہ قہقہہ سے نقض وضو کا ثبوت طبرانی کی روایت کردہ اس حدیث سے لیا گیا ہے جو حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی ہے، مگر روایت مذکورہ کو اکثر علماء نے مرسل قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں ابن القیم نے اور کئی مثالیں اس میں دی ہیں۔ مثلاً امام ابوحنیفہ نے سفر میں نبیذ تمر سے وضو کی حدیث کو قیاس پر مقدم گردانا حالانکہ حدیث ضعیف ہے، نیز دس درہم کی چوری پر ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے حالانکہ اس سلسلے میں وارد حدیث ضعیف ہے اور حیض کی اکثر مدت دس دن قرار دی حالانکہ یہ بھی حدیث ضعیف میں آیا ہے اور اقامت جمعہ کے لئے مصر وشہر کا ہونا شرط قرار دیا ہے جبکہ اس سلسلے کی حدیث بھی ضعیف ہے۔ (۱)

مگر اس جگہ ابن القیم نے یا دوسرے حضرات نے جو مثالیں دی ہیں، وہ بعد البحث والتفحص مسئلہ زیر بحث کے مطابق نہیں معلوم ہوتیں؛ کیونکہ قہقہہ سے نقض وضو کی حدیث جس طرح مرسلاً آئی ہے اسی طرح موصولاً بھی آئی ہے۔ (۲)

پھر اگر بالفرض یہ مرسل ہی ہے، تب بھی اس سے احتجاج اس بنا پر کیا گیا کہ امام ابوحنیفہ وغیرہ مرسل کو ضعیف ہی نہیں کہتے، جیسا کہ اوپر گزرا، لہٰذا یہ حدیث اس جگہ مثال نہیں بن سکتی۔ اسی طرح دیگر احادیث ایسی ہیں جن کا ضعف منجبر ہے اور وہ قرائن سے مؤید اور محتف ہیں جیسا کہ اپنی جگہ اس کی بحث مذکور ہے۔

لہٰذا یہ ساری احادیث ضعیف منجبر کی قسم سے ہیں اور یہاں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے کہ حدیث منجبر الضعف قابل قبول ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ تو اوپر عرض کر دیا گیا۔

---

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۷۷ (۲) اعلاء السنن: ۱/۹۶

پھر ان مثالوں کے علاوہ بھی کوئی اور مثال ہم کو ایسی نہیں مل سکی کہ ان ائمہ نے حدیث کے ضعیف ہونے کے باوجود اس سے احکام میں استدلال واحتجاج کیا ہو۔

اور خود ابن القیم نے تصریح کردی ہے کہ ان حضرات ائمہ کے کلام میں ضعیف سے مراد وہ ضعیف نہیں جو متاخرین کی اصطلاح میں ضعیف کہلاتی ہے بلکہ اس سے مراد حسن ہے۔ (۱)

لہٰذا بندہ کے نزدیک یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ضعیف غیر منجبر الضعف کا احکام میں اعتبار نہیں اور ان حضرات کے کلام میں جو واقع ہوا کہ ضعیف حدیث قیاس سے مقدم ہے، اس سے مراد (واللہ اعلم) ضعیف منجبر الضعف ہے نہ کہ مطلق ضعیف۔

الغرض ایک تو یہ صورت بیان کی گئی ہے جس میں ضعیف حدیث قابل قبول ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس باب میں کوئی اور حدیث سوائے ضعیف حدیث کے ثابت نہ ہو تو یہ مقبول ہوتی ہے مگر جیسا کہ عرض کیا گیا اس پر کوئی مثال ودلیل نہیں ملتی اور جو اس کی مثالیں دی گئی ہیں، وہ سب کی سب ضعیف منجبر کی ہیں۔

اور دوسری صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ حدیث ضعیف اس وقت بھی احکام میں قبول کی جاتی ہے جب کہ اس میں احتیاط کا پہلو ہو۔ علامہ نوویؒ اپنی کتاب ''الاذکار'' میں فرماتے ہیں کہ:

" قال العلماء من المحدثين والفقهاء وغيرهم يجوز ويستحب العمل في الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف مالم يكن موضوعاً ، وأما الأحكام كالحلال والحرام والبيع والنكاح والطلاق وغير ذلك فلا يُعْمَلُ فيها إلا بالحديث الصحيح أو الحسن إلا أن يكون

(۱) اعلام الموقعین: ۱/۳۱-۷۷

فيه احتياط في شيء من ذلك .(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث ضعیف اس صورت میں قابل عمل ہے جبکہ اس میں احتیاط کا پہلو ہو اور اسکی توضیح بھی خود امام نوویؒ نے اس کے بعد اس طرح فرمائی ہے:

" كما إذا ورد حديث ضعيف بكراهة بعض البيوع أو الأنكحة فإن المستحب أن يتنزّه عنه ولكن لا يجب". (۲)

لہٰذا اگر کسی حدیث ضعیف میں کسی کام سے منع کیا گیا ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس پر عمل کرتے ہوئے اس سے پرہیز کیا جائے ؛ کیونکہ اسی میں احتیاط ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے بھی تدریب میں اس کو ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

" ويُعْمَلُ بالضعيف أيضاً في الأحكام إذا كان فيه احتياط". (۳)

مگر یہ ضعیف پر عمل اس صورت میں بھی صرف جائز یا مستحب ہے، واجب وضروری نہیں جیسا کہ امام نووی نے تصریح کر دی ہے۔

متقدمین کی اصطلاح میں ضعیف کا مفہوم

اس ضمن میں بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ وامام احمد وغیرہ کے کلام میں احادیث ضعیفہ پر عمل کی گنجائش نقل کی جاتی ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد حسن لغیرہ ہے یا وہ حدیث جو متاخرین کے نزدیک ضعیف کہلاتی ہے؟

یہ بحث بڑی اہمیت کی حامل ہے اور بہت ہی معرکۃ الآراء بھی ہے، اور اس سلسلہ میں عام طور پر دو نظریات ملتے ہیں: ایک یہ کہ اس سے وہ حدیث ضعیف مراد ہے جو متاخرین کی اصطلاح میں ضعیف کہلاتی ہے، عموماً جن حضرات نے ان

---

(۱) الاذکار: ۱۵ (۲) الاذکار: ۱۵ (۳) تدریب الراوی: ۱/۲۹۹

ائمہ کا کلام نقل کیا ہے اور اس کو معرض بحث میں پیش کیا ہے وہ اسی طرف گئے ہیں۔

مگر اس کے برعکس شیخ الاسلام ابن تیمیہ وعلامہ ابن القیم نے اس سے مراد حدیث حسن لی ہے اور یہ دعوی بھی کردیا ہے کہ جن لوگوں نے امام احمد کے قول میں ضعیف سے مراد وہ حدیث لی ہے جو متاخرین کے نزدیک ضعیف کہلاتی ہے، انہوں نے غلطی کی ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ متقدمین کی اصطلاح میں حدیث کی صرف دو اقسام تھیں: ایک صحیح اور دوسرے ضعیف، اور سب سے پہلے امام ترمذی نے حدیث کی تین قسمیں قرار دیں: صحیح، حسن، ضعیف، ان سے پہلے حدیث یا تو صحیح تھی یا ضعیف، پھر ضعیف میں ایک قسم وہ تھی جس سے احتجاج درست ہے، اسی کو ترمذی نے حسن کا نام دیا اور ایک قسم وہ تھی جس سے احتجاج درست نہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنے فتاوی میں فرماتے ہیں:

"ومن نَقَلَ عن أحمد أنه كان يحتجُّ بالحديث الضعيف الذي ليس بصحيح ولاحسن فقد غلط عليه، ولكن كان في عرف أحمد بن حنبل ومن قبلَه من العلماء أن الحديـث ينقسم إلى نوعين: صحيح و ضعيف . والضعيف عندهم ينقسم إلى ضعيف متروك لايُحتَجُّ بِهِ وإلى ضعيف حَسَن ـــــوأوّل من عُرِفَ أنه قسّم الحديثَ ثلاثة أقسام : صحيح ،وحسن، وضعيف، هو أبو عيسى الترمذي في جامعه ، والحَسَنُ عنده ما تعدّدت طرقُه ولم يكن في رُواته مُتّهَم وليس بشاذ، فهذالحديث وأمثاله يُسَمّيهِ أحمد ضعيفاً ويحتجّ به " (۱)

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

---

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۱/۲۵۱-۲۵۲

”والترمذي أول من قسّم الأحاديث إلى صحيح وحسن وغريب وضعيف ، ولم يُعْرَفْ قبلَه هذا التقسيم عن أحمد ، لكن كانوا يُقسّمُون الأحاديث إلى صحيح وضعيف كما يُقسِّمون الرجال إلى ضعيف وغيرضعيف ، والضعيف عندهم نوعان:ضعيف لايُحْتَجُّ بِهِ وهو الضعيف في اصطلاح الترمذي ، والثاني ضعيف يُحْتَجُّ بِهِ وهوالحسن في اصطلاح الترمذي “. (١)

اورامام ابن تیمیہ کی اقتداء میں یہی بات علامہ ابن القیم نے بھی فرمائی ہے:

”وليس المراد بالضعيف عنده الباطل ولا المنكر ولا ما في رواته مُتَّهَمٌ بحيث لا يسوغ الذهاب إليه فالعمل به ، بل الحديث الضعيف عنده (أي عندالامام أحمد)قسيم الصحيح وقسمٌ من أقسام الحسن ولم يكن يُقَسِّمُ الحديثَ إلى صحيح وحسن و ضعيف، بل إلى صحيح وضعيف، وللضعيف عنده مراتب “. (٢)

اورعلامہ شیخ حسین الیمانی نے اپنے رسالہ ”التحفة المرضيه“ میں اسی کو اختیار کیا ہے اور علامہ عبدالرحمان بن سلیمان سے اور دیگر حضرات سے اسی کونقل کیا ہے اور انہی کی اقتداء میں ہمارے شیخ المشائخ علامہ ظفر احمد عثمانی نے ”اعلاء السنن“ میں اور اس کے مقدمہ میں اسی قول کواختیار کیا ہے اور بحث کے آخر میں فرمایا کہ:

”هذا هو الصحيح الحق الصراح لا يعدل عنه محقق إلى غيره ، وأعني به أن المراد بالضعيف عندهم في موضع الاحتجاج إنما هوالحسن المصطلح عند المتاخرين ؛ فإن الضعيف المصطلح عند المتاخرين ليس بشيء يُعْتَدُّ به فكيف يسوغ لأهل العلم أن يحتجُّوا به “. (٣)

(١) فتاویٰ ابن تیمیہؒ:۲۴۹/۱۸ (٢) اعلام الموقعین:۳۱/۱ (٣) مقدمہ اعلاء السنن:۶۱/۱

یہ دو نظریات ہمارے سامنے ہیں اور بعض علماء نے ابن تیمیہؒ وابن القیم کے نظریہ پر تنقید بھی کی ہے، چنانچہ علامہ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے مقدمۂ اعلاء السنن پر اپنی تعلیقات میں شیخ استاذ عوامہ سے امام ابن تیمیہ کی بات پر مفصل تنقید نقل کی ہے اور ان کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ امام احمد کے قول میں ضعیف سے مراد وہی ضعیف ہے جو متاخرین کی اصطلاح میں ضعیف کا مصداق ہے اور امام احمد اور دیگر متقدمین کے یہاں بھی ترمذی کی طرح حدیث کی تینوں اقسام صحیح، حسن وضعیف کا ذکر ملتا ہے، اور امام ابن تیمیہ کی یہ بات صحیح نہیں کہ حدیث کی یہ تقسیم سب سے پہلے امام ترمذی نے کی ہے، پھر شیخ عوامہ نے امام ترمذی سے پہلے کے بہت سے محدثین سے حدیث حسن کی اصطلاح نقل کی ہے۔ (۱)

شیخ استاذ عوامہ فرماتے ہیں کہ:

امام احمد کے کلام میں ضعیف کی تفسیر حسن سے کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ان کے کلام سے ظاہر یہی ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ راوی کا کوئی اعتبار نہیں جب تک کہ کوئی نص مسئلہ میں منقول ہو اگرچہ وہ ضعیف ہو؛ کیونکہ ضعیف حدیث رائے سے بہتر ہے............اگر ہم ضعیف کی تفسیر حسن سے کریں تو اس تصریح کا جو امام احمد نے فرمائی ہے، کیا فائدہ ہوا؟ کہ حدیث حسن رائے پر مقدم ہے حالانکہ یہ امر ثابت و مقرر ہے۔ (۲)

لیکن احقر کے نزدیک اس مسئلہ میں ذرا تفصیل ہے، وہ یہ کہ شیخ محمد عوامہ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ امام ترمذی سے پہلے بھی حدیث حسن کی اصطلاح متقدمین کے کلام میں ملتی ہے اور رائج تھی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان حضرات کے

---

(۱) تعلیقات مقدمۂ اعلاء السنن للشیخ ابی غدہ: ۶۲ تا ۶۶ (۲) ایضاً

نزدیک ضعیف کا اطلاق حسن پر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حسن کی اصطلاح بھی تھی اور وہ اپنے کلام میں اس کا اطلاق اسی اصطلاحی معنی میں کیا کرتے تھے، لہٰذا یہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی وہ حضرات صحیح کے مقابلہ میں ضعیف کا اطلاق کرتے ہوں اور اس میں حسن کو بھی داخل کرتے ہوں اور یہی شیخ ابن تیمیہ کی مراد ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان حضرات نے بہت سی احادیث پر ضعف کا حکم لگایا ہے جبکہ ان احادیث کے متعدد طرق ثابت ہیں جس کی وجہ سے وہ احادیث ضعیف نہیں رہتیں بلکہ ''حسن لغیرہ'' قرار پاتی ہیں، مگر اس کے باوجود ان پر ضعف کا حکم لگایا گیا ہے۔ اب یا تو یہ کہئے کہ ان حضرات کو ان احادیث کے دیگر طرق پر اطلاع نہیں تھی مگر یہ بات بعید از قیاس ہے، یا یہ کہنا ہوگا کہ ان حضرات کے نزدیک ضعیف کا اطلاق حسن پر بھی ہوا کرتا تھا، لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔ اس طرح کی احادیث جن پر باوجود تعدد طرق کے ضعف کا حکم لگایا گیا ہے، کتب حدیث کے تتبع سے بآسانی معلوم ہوسکتی ہیں۔

لہٰذا ہمارے نزدیک امام احمد وامام ابوحنیفہ وغیرہ کے کلام میں واقع ''ضعیف'' کا لفظ محتمل ہے، دونوں معنوں کے لیے مگر جب ہم ان مثالوں پر غور کرتے ہیں جو احکام میں حدیث ضعیف کو قبول کرنے کے سلسلے میں دی جاتی ہیں تو پھر ایک احتمال متعین ہوجاتا ہے کہ اس سے مراد ان حضرات کی حدیث حسن لغیرہ ہے نہ کہ وہ ضعیف جن کا ذکر متاخرین کرتے ہیں۔ البتہ امام احمد سے فضائل کے باب میں تساہل جو منقول ہے، وہاں بلاشک ضعیف ہی مراد ہے۔ ابن حجر نے ''القول المسدد'' میں فرمایا ہے کہ:

”وقد ثبت عن الإمام أحمد وغيره من الائمة أنهم قالوا إذا روينا في الحلال والحرام شدّدنا وإذا روينا في الفضائل ونحوها تَسَاهَلْنَا “. (۱)

اس قول میں امام احمد نے حدیث کے بارے میں اپنا نظریہ ومعیار خود ہی بتادیا ہے کہ جب احکام کا معاملہ ہوتا ہے تو سختی سے روایت کو جانچتے ہیں اور فضائل میں تساہل سے کام لیتے ہیں ۔تو یہاں مراد یہی ہے کہ ضعیف (المصطلح عليه عند المتاخرين) کوبھی فضائل میں قبول کر لیتے ہیں ۔امام ابن تیمیہ نے بھی اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

”قول أحمد بن حنبل إذا جاء الحلال والحرام شدّدنا في الأسانيد وإذا جاء الترغيب والترهيب تساهلنا في الأسانيد ، وكذلك ما عليه العلماء من العمل بالحديث الضعيف في فضائل الأعمال ـــــــ ـــــــ إنما مرادهم بذلك أن يكون العمل مما قد ثبت أنه ممّا يحبُّ اللّٰه أو ممّا يكره اللّٰه بنص أو إجماع كتلاوة القرآن والتسبيح والدعاء والصدقة والعتق والإحسان إلى الناس و كراهة الكذب والخيانة ونحو ذالك. فإذا رُوِيَ حديثٌ في فضل بعض الأعمال المستحبّة وثوابها وكراهة بعض الأعمال وعقابها فمقادير الثواب والعقاب وأنواعه إذا رُوِيَ فيها حديثٌ أنه لانعلم أنه موضوع جاء ت روايته والعمل به بمعنى أن النفس ترجو ذلك الثواب أو تخاف ذلك العذاب“. (۱)

اس عبارت میں شیخ الاسلام نے واضح کیا ہے کہ امام احمد وغیرہ حضرات کے کلام میں حدیثِ ضعیف کے فضائل کے باب میں قبول کئے جانے کا جو ذکر ملتا ہے

(۱) القول المسدد فی الذب عن مسند الامام احمد: ۱۱-۱۲ (۲) فتاوی ابن تیمیہؒ: ۱۸/۶۵-۶۶

اس سے مراد "حدیث ضعیف" ہی ہے؛ کیونکہ امام احمد کے کلام کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن وسنت میں یا اجماع میں کسی عمل کا اللہ ورسول کے محبوب اعمال میں سے ہونا ثابت ہو، پھر اسی سلسلہ میں ایک حدیث سامنے آئے جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ موضوع نہیں تو اس حدیث کو قبول کیا جائے گا، معلوم ہوا کہ اس سے حدیث ضعیف ہی مراد ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ ائمہ کے کلام میں ضعف کے قابل قبول ہونے کی بات ایک تو احکام کے بارے میں آئی ہے اور دوسرے فضائل وترغیب وترہیب کے بارے میں آئی ہے۔ احکام کے بارے میں ضعیف سے مراد "حسن" اور فضائل میں ضعیف سے مراد ضعیف ہے۔

رہا یہ سوال جس کو شیخ محمد عوامہ نے اٹھایا ہے کہ اگر امام احمد کے کلام میں ضعیف سے مراد حسن ہے تو ان کو اس تصریح کی کیا ضرورت تھی اور اس کا آخر کیا فائدہ؟ جبکہ یہ بات مسلم ومقرر وثابت ہے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ حسن لغیرہ کا احکام میں معتبر ہونا سب کے نزدیک مسلم نہیں ہے؛ کیونکہ ابن القطان سے ابن حجر نے اپنی " النکت علی ابن الصلاح " میں نقل کیا ہے کہ حسن لغیرہ صرف فضائل میں مقبول ہے، احکام میں اس کو قبول کرنے میں توقف کیا جانا چاہئے الا یہ کہ مزید قوت دیگر قرائن سے حاصل ہوجائے، انکی عبارت یہ ہے:

" إن هذا القسم لا يُحْتَجُّ به كُلِّهِ بل يُعْمَلُ بِهِ في فضائل الأعمال ويُتَوَقَّفُ عن العمل به في الأحكام إلا إذا كَثُرَت أو عضده اتصال عمل أو شاهد صحيح أو ظاهر القرآن ". (۱)

---

(۱) النکت: ۴۰۳/۱

حافظ ابن حجر کے حوالے سے ابوالحسن بن القطان کے اس قول کو متعدد حضرات نے نقل کیا ہے، جیسے علامہ سخاوی نے ''فتح المغیث'' میں، علامہ طاہر الجزائری نے ''توجیہ النظر'' میں، علامہ امیر الصنعانی نے ''توضیح الافکار'' میں نقل کیا ہے۔ (۱)

اور حافظ ابن حجر نے اس کو نقل کرنے کے بعد اس کو قوی اور بہترین رائے قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''وھذا قوي حسن رایق ، ما أظنُّ یأباہ مُنصِف''. (۲)

اس قول کے پیش نظر میں کہتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ امام احمد نے یہ تصریح اس لئے کی ہو کہ ان کے شیخ ''ابن القطان'' سے اپنا اختلاف ظاہر کرنا چاہتے ہوں کہ میرے نزدیک ''حسن لغیرہ'' نہ صرف فضائل میں بلکہ احکام میں بھی مقبول ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں کوئی اور حدیث نہ ہو اور یہ کہ حدیث حسن رائے سے بہتر ہے۔

الغرض حسن لغیرہ کے احکام میں معتبر ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے، ابن القطان اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک حسن لغیرہ کا احکام میں اعتبار نہیں الا یہ کہ کثرت طرق یا اتصال عمل یا شاہد صحیح یا ظاہر قرآن سے مؤید ہو، اور امام احمد و امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ اس کے قائل ہیں کہ اگر باب میں کوئی اور حدیث ثابت نہ ہو تو اپنی رائے سے بہتر حدیث حسن لغیرہ ہے۔

اسی اختلاف کے پیش نظر امام احمد وغیرہ ائمہ نے اس مسئلہ کی تصریح کی ہے کہ حسن لغیرہ فضائل میں بھی معتبر ہے اور احکام میں بھی معتبر ہے، لہٰذا شیخ عوامہ کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ اگر امام احمد کے کلام میں ضعیف سے مراد حسن ہے تو ان کو اس تصریح کی کیا ضرورت تھی اور اس کا آخر کیا فائدہ؟ جبکہ یہ بات مسلم ومقرر وثابت ہے؟ ہم نے بتا دیا کہ یہ دراصل ابن القطان کے اختلاف کی وجہ سے تصریح کی گئی ہے اور یہ بے

---

(۱) فتح المغیث: ۱/۸۹، توجیہ النظر: ۲/۶۵۳، تدریب: ۱/۲۹۸، درمختار مع ردالمختار: ۱/۲۸، مقدمۂ اعلاء السنن: ۱/۵۸، حاشیۃ الاعتصام: ۱/۲۲۸ (۲) النکت: ۱/۴۰۳

فائدہ نہیں۔ (واللہ اعلم)

نوٹ: احقر نے خاص اس مسئلہ پر اپنے ایک عربی مقالے میں بعنوان: "تحقیق الحدیث الضعیف في کلام الأئمة" شرح وتفصیل سے کلام کیا ہے، جو حضرات تحقیق چاہتے ہوں وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

حدیث ضعیف، فضائل میں

حدیث ضعیف (المصطلح علیه عند المتاخرین) کیا فضائل وترغیب وترہیب کے باب میں معتبر ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں جمہور کی رائے یہی ہے کہ فضائل وترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث کا اعتبار ہے اور اس کو روایت کرنا اور اس کے ضعف کے بیان کرنے میں تساہل جائز ہے۔

حدیث ضعیف کے اجمالی حکم کے تحت ابن الصلاح کا قول نقل کیا جا چکا ہے، نیز امام احمد وغیرہ ائمہ کا قول ابن حجر کے حوالہ سے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، امام نووی کا قول بھی "الاذکار" کے حوالہ سے پیش کر چکا ہوں، امام نووی نے اسی بات کو اپنی کتاب "ارشاد الطلاب" اور "الاربعین" میں بھی دہرایا ہے۔ (۱)

نیز علامہ ابن تیمیہ کی عبارت بھی ابھی اوپر گذری جس میں انہوں نے اسی کو اختیار فرمایا ہے، اور علامہ نوویؒ نے "الاربعین" کے مقدمہ میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ حدیث ضعیف پر فضائل میں عمل جائز ہے، اگر چہ اس دعوی اتفاق سے اتفاق کرنا مشکل ہے؛ کیونکہ جمال الدین قاسمی نے ذکر کیا ہے کہ یحیی بن معین سے ابن سید الناس نے نقل کیا ہے کہ حدیث ضعیف نہ احکام میں معتبر ہے اور نہ فضائل میں، اور لکھا ہے کہ "فتح المغیث" میں اسکو ابوبکر ابن العربی کی طرف منسوب کیا ہے اور امام بخاری ومسلم کا مذہب بھی بظاہر یہی تھا۔ (۲)

(۱) مقدمہ اربعین: ۳ وارشاد الطلاب: ۱/۲۷۰-۲۷۱ (۲) قواعد وفوائد من الاربعین النبویہ: ۱۷

بعض معاصرین کی غلطی کا ازالہ

ہم نے امام ابن تیمیہ کو بھی اس مسئلے میں جمہور کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس پر دلیل ان کی وہ عبارت ہے جو ابھی اوپر ہم نے نقل کی ہے، لیکن بعض معاصر علماء کو نامعلوم کیوں یہاں پر دھوکہ ہوا کہ انہوں نے امام ابن تیمیہ کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو حدیث ضعیف کو کسی میں بھی معتبر نہیں مانتے، جیسے شیخ ناصر الدین البانی نے ''صحیح الجامع الصغیر'' میں اور علامہ احمد شاکر نے ''الباعث الحثیث'' میں ان کی ان عبارات سے استدلال کرتےہوئے، جس میں انہوں نے امام احمد کے قول کی تشریح میں فرمایا کہ اس سے مراد حسن ہے نہ کہ ضعیف، یہ کہا ہے کہ مطلقاً امام ابن تیمیہ کے نزدیک حدیث ضعیف نا قابل اعتبار ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ احکام میں حدیثِ ضعیف کو نہیں مانتے، جیسا کہ امام احمد وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ اور جو امام احمد کے کلام میں ضعیف کا لفظ آتا ہے، اس سے مراد ابن تیمیہ کے نزدیک حسن ہے، لیکن فضائل وترغیب وترہیب میں وہ جمہور علماء کے ساتھ ہیں، البتہ وہ فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے کوئی امر مستحب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایک حکم شرعی ہے اور حکم شرعی ضعیف حدیث سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ (۱)

لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ فضائل وترغیب کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل کو بھی جائز نہیں کہتے، بلکہ ہم نے اوپر ان کی جو ایک لمبی عبارت نقل کی ہے اس سے اس کے بالکل خلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث ضعیف پر فضائل میں عمل کو جائز سمجھتے ہیں، ہم نے اس مسئلہ پر بھی ہمارے عربی مقالے میں بحث کی ہے۔

---

(۱) فتاوی ابن تیمیہ: ۶۵/۱۸

ضعیف پرعمل کے شرائط

بہر حال جمہور کے نزدیک حدیث ضعیف فضائل وترغیب وترہیب میں معتبر ہے، یعنی اس پرعمل جائز ہے، لیکن اس کے لئے علماء نے چند شرائط بیان کئے ہیں:

(۱) وہ حدیث شدید الضعف نہ ہو۔ (۲) کسی اصل عام کے تحت مندرج ہو۔

(۳) اسکی سنیت کا اعتقاد نہ رکھا جائے۔

ان شرائط کا ذکر متعدد حضرات محدثین وفقہاء نے کیا ہے۔ (۱)

ان کی تفصیل یہ ہے کہ:

(۱) حدیث شدید الضعیف نہ ہو، یعنی اس کے رواۃ میں کذاب ومتہم بالکذب یا فاسق راوی نہ ہو، پس اگر راویوں میں کوئی راوی کذاب ہے یا متہم بالکذب ہے یا فاسق ہے تو اس کی حدیث فضائل میں بھی معتبر اور قابل قبول نہ ہوگی، یعنی اس پرعمل جائز نہ ہوگا۔

(۲) اصل عام کے تحت داخل ہو، یعنی اس میں کوئی نئی بات بیان نہ کی گئی ہو جیسے کوئی نئی قسم کی نماز یا کوئی مقدار وغیرہ رکعات کی یا کسی اور چیز کی بیان نہ کی گئی ہو، بلکہ جو بات پہلے سے کسی نص یا اجماع سے ثابت ہو اس کی کوئی فرع اس حدیث میں ہو تب وہ قابل عمل ہوگی۔ (۲)

(۳) اس کی سنیت کا اعتقاد نہ رکھا جائے؛ کیونکہ جب حدیث صحیح نہیں ہے تو حضور علیہ السلام کی طرف اس کو منسوب کرنا درست نہ ہوگا، لہٰذا سنت ہونے کا اعتقاد درست نہ ہوگا بلکہ صرف احتیاط کی نیت سے عمل کرنا چاہئے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

---

(۱) تدریب:۱/۲۹۸، درمختار:۱/۱۲۸ (۲) فتاوی ابن تیمیہؒ:۱۸/۶۵-۶۶